میں اور
موسیٰ
عذرا عباس

میں اور موسیٰ

ناول

عذرا عباس

Mein aur Mosa

Azra Abbas

اشاعت: ۲۰۰۷ء

کمپوزنگ: احمد گرافکس، کراچی

طباعت: طالب ایچ کھوکھر پرنٹرز، کراچی

بی۔ ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔

info@scheherzade.com

O

یہ ناول ۱۹۸۲ء میں لکھا گیا۔ پھر اس کو میں نے سینت کر رکھ دیا۔ گاہے گاہے پڑھتی اور اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ اضافہ ہوجاتا۔ کئی بار سوچا، اسے چھپوا دوں۔ لیکن شاعری نے مہلت نہ دی۔ وقت گذرتا رہا۔ آنے جانے والوں کو اس کے بارے میں بتاتی رہی۔ پھر میں نے ایک دن فیصلہ کیا کہ اس کو چھپوانا ہے اور اس فیصلے کو آخری شکل دیتے ہوئے بھی کئی سال اور گذر گئے۔ آخر آصف فرخی نے اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور اب یہ ناول شائع ہو رہا ہے۔

عذرا عباس

دیکھ سیلاب اس بیاباں میں...

میرؔ

پہلا باب

(۱)

موسیٰ میرا بڑا اچھا دوست تھا۔ دھوپ میں چمکتی ہوئی اس کی ناک خنجر کی نوک کی طرح پتلی اور چمکیلی نظر آتی تھی، یا مجھے اچھی لگتی تھی۔ میں نے موسیٰ سے پوچھا، ''تم کیا کر رہے ہو؟''

وہ زمین پر جھکا اپنی چھوٹی انگلی سے مٹی ہٹانے میں لگا تھا۔

''زمین کھود رہا ہوں۔''

''کیوں؟ اس بھربھری مٹی میں تم کو کیا ملے گا۔''

''خزانہ۔''

''خزانہ؟'' میں حیران ہو رہی تھی۔ ''کیا تم اپنی انگلی سے اتنی زمین کھود لو گے؟''

''ہاں،'' موسیٰ نے سر اٹھا کر مجھے گھورا۔ اس کے گھورنے پر میں پیچھے ہٹ گئی۔

''تمھیں معلوم ہے خزانہ کیا ہوتا ہے؟''

میں نے کہانیوں میں خزانے کے بارے میں پڑھا تھا، جو ڈاکو کہیں سے چُراتے ہیں اور زمین میں دفن کر دیتے ہیں۔ اپنے اتنے علم پر میں اترا اٹھی۔

''ہاں،'' وہ مسلسل زمین کھودتے ہوئے سر جھکائے جھکائے بولا۔

میں اس وقت اسٹیٹس کونشس تھی۔ موسیٰ جھونپڑی میں رہتا تھا اور میں مکان میں۔ موسیٰ کے پاس کوئی باورچی خانہ اور کوئی باتھ روم نہیں تھا، موسیٰ کی ماں ایک ہی جھونپڑی میں سب کو سُلاتی، کھلاتی اور کھانا پکاتی تھی۔

میں نے موسیٰ سے کہا، ''تم یہ خزانہ لے کر پتہ ہے کیا کرو گے؟''

وہ چھوٹی انگلی سے زمین کھودتے ہوئے ہنکارا۔

''تم سب کے سب اسے نگل جاؤ گے اور تمھارے پیٹ پھول جائیں گے۔ صبح کے ایم سی کی گاڑی تمھیں پیچھے والے میدان میں دفن کر آئے گی۔'' مجھے بلا وجہ کا مذاق

سوجھ رہا تھا۔

''چپ بدبخت، خاموش،'' وہ مٹی جھاڑ کر اٹھا اور ساتھ ہی ساتھ اس نے بہت سی مٹی میرے اوپر اچھال دی۔ میری سرمئی فراک اور سفید جوتے بھوری مٹی میں چھپ گئے۔

''کمینے، حرامی'' یہ گالی میں نے بڑی محنت سے یاد کی تھی، یہ گالی مجھے اچھی لگتی تھی۔ میں نے ابا سے اس کے مطلب پوچھے تھے ایک بار، وہ نہایت اطمینان سے بولے، ''بیٹا اس کے مطلب بتاؤں گا تو اللہ میری زبان پر انگارے رکھ دے گا۔'' میں خوف زدہ ہو گئی تھی۔ لیکن یہ گالی مجھے یاد رہ گئی۔ اب بھی جب کوئی مجھے برا لگتا ہے تو میری زبان بے آواز اس گالی کو دہراتی ہے۔

موسیٰ مجھے اجلی نظروں سے گھورنے لگا۔ ''نہیں، تجھے مل جائے یہ خزانہ، اور تیرا باپ موٹر سائیکل کے بجائے موٹر پر بیٹھ کر جایا کرے اور تو انگریزی اسکول میں جائے۔''

موسیٰ کو معلوم تھا کہ میں سرکاری اسکول میں پڑھ رہی ہوں، جہاں تختی لکھائی جاتی ہے اور ملتانی مٹی سے لپی یہ تختی اکثر میرے سر پر پڑتی رہتی ہے۔

''بکواس بند کر۔ میں انگلش کی کتاب پڑھتی ہوں، ابا مجھ سے انگلش بولتے ہیں، تیرے گھر میں تو ہر وقت گالیاں بکی جاتی ہیں۔''

میں جب بھی موسیٰ کی جھونپڑی کی طرف سے گزرتی تھی، موسیٰ کی ماں کی رونے، جھینکنے اور گالیاں بکنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

''ہاں، ہاں'' موسیٰ چہکا، ''گالیاں میرے گھر میں بکی جاتی ہیں لیکن سیکھ تو گئی ہے۔''

میں نے ویسے ہی کچھ نہیں کہا۔ میں اب نرم پڑ گئی تھی۔

''دیکھ موسیٰ کیا واقعی تو یہ خزانہ نکال لے گا؟'' اب میں دل ہی دل میں موسیٰ کے خزانہ نکال لینے پر کڑھ بھی رہی تھی۔

وہ پھر مستعدی سے زمین کھودنے بیٹھ گیا تھا۔

''ہاں، خزانہ نکالوں گا،'' اس نے عجیب نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا تھا، جیسے اس کی مفلسی کی ذمہ دار میں ہوں۔ اس کے جسم پر ایک لمبا جوڑا جو اکثر میلا رہتا تھا، اس کے پاؤں ننگے رہتے تھے اور ان پر چھوٹے چھوٹے زخم نظر آتے تھے، سوائے اس کے چہرے کے، جس پر مجھے اکثر اس تصویر کا گمان ہوتا تھا جو میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی تھی اور ابا نمائش سے خرید کر لائے تھے۔ بالکل دُھلا ہوا، وہ چہرہ کسی دن کے ابھرتے ہوئے سورج کی طرح نظر آتا تھا۔

میں اکثر موسیٰ کو چھیڑتی تھی، ''تمھارا منہ اتنا صاف رہتا ہے باقی ہاتھ پاؤں اتنے گندے، اور سر......'' مجھے اس کے بال بہت اچھے لگتے تھے میلے رہنے کے باوجود وہ ریشم کے لچھوں کی طرح ہوا میں ہلتے رہتے تھے۔ میں اس کے بال کبھی کبھی مٹھی میں پکڑ کر جھنجھوڑ دیتی تھی۔

''تم مجھے اپنے بالوں کی وجہ سے اچھے لگتے ہو۔''

وہ مسکراتے ہوئے کہتا، ''بال تو تمھارے بھی ایسے ہی ہیں۔''

''اچھا'' میں اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے بالوں سے نگاہوں ہی نگاہوں میں موازنہ کرنے لگتی، لیکن اس تعریف کے باوجود مجھے اپنے بال کبھی موسیٰ کے بالوں سے زیادہ اچھے نہیں لگے۔ میں دیر تک موسیٰ کو زمین کھودتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کی باتیں تو مجھ کو اکثر سمجھ میں نہیں آتی تھیں لیکن یہ کام تو اور بھی میری سمجھ سے باہر تھا، جس کو میں موسیٰ کی تمام باتوں کی طرح اہم سمجھنے لگی تھی۔ اس وقت میری ناسمجھی مجھے موسیٰ کی باتوں کی طرف لے جاتی تھی لیکن بعد میں وہ سب تو اور پیچیدہ نظر آنے لگا تھا۔ جوں جوں وقت آگے بڑھ رہا تھا اور مجھ میں سمجھنے کی صلاحیت بڑھ رہی تھی۔ موسیٰ میری نظر میں اور اہم ہوتا جا رہا تھا۔

میرے اور موسیٰ کے گھر کے درمیان ایک میدان تھا، جو تکون شکل میں بنا ہوا تھا۔

میرے گھر کی طرف آتے آتے اس کا ایک کونہ رہ جاتا تھا، جس کے ایک طرف درمیانے درجے کے لوگ رہتے تھے اور ان میں سے کچھ اپنی تمام تر کوششوں سے درمیانے درجے سے اوپر جانا چاہتے تھے۔ ان کا رہن سہن، رکھ رکھاؤ بتاتا تھا کہ شاید وہ اس میں کامیاب ہو جائیں۔ شاید میرے ماں باپ بھی اسی خواہش کا شکار تھے۔

موسیٰ کی بستی اس میدان کے دوسری طرف تھی۔ اس میدان کے لوگوں کے بارے میں مجھے صرف اتنا پتہ تھا کہ وہ بہت غریب ہیں۔ ان کے پاس رہنے کے لیے اور پہننے کے لیے اکثر کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے چولھے بہت دیر سے جلتے ہیں، جب اس علاقے کے مرد، دن بھر کی مزدوری کے بعد روزانہ کی کمائی ساتھ لے کر لوٹتے ہیں تو ان کی عورتیں اسی حساب سے کھانا پکاتی ہیں۔ ہر جھونپڑی میں بچوں کی ایک یلغار تھی۔ ننگے، بھوکے اور حواس باختہ بچے، جو دن بھر دھول اور دھوپ میں لوٹتے رہتے تھے۔ ان کے ہاں اسکول جانے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ وہ اکثر ہمارے دروازوں پر آ کر کھڑے ہو جاتے تھے، ''ٹی وی دکھا دو۔'' اماں جب بھی اچھے موڈ میں ہوتیں تو ٹی وی کا رخ دروازہ کھول کر باہر کی طرف کر دیتیں اور وہ باہر کے کھلے دروازے سے ایک دوسرے پر جھانک جھانک کر اور دھکے دے دے کر ٹی وی دیکھا کرتے۔ وہ بھی جب، ان میں سے ان کا کوئی ساتھی کہیں سے یہ خبر سن کر آتا کہ آج ٹی وی پر کوئی اچھا ڈرامہ آنے والا ہے، یا جب اماں کا موڈ اچھا ہوتا۔ وہ جب تک چاہتیں وہ دروازہ کھلا رہتا اور جب چاہتیں بند کر دیتیں۔ ایسا اکثر کئی گھروں میں ہوتا۔ جب کوئی ان کو دھتکار دیتا وہ دوسرے کے گھر پر پہنچ جاتے۔

میں نے ایک دفعہ موسیٰ سے کہا تھا، ''تمھارے گھر میں بھی تو ٹی وی نہیں ہے تم بچوں کے ساتھ ٹی وی دیکھنے کیوں نہیں آتے۔ میں تمہیں اندر بٹھاؤں گی، تم میرے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھنا۔''

وہ پھنکارا تھا، ''ہوں، میں بھیک منگوں کی طرح تیرے دروازے پر بیٹھ کر ٹی وی

دیکھوں گا اور تیری ماں، جو جب میری طرف دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں سے ایسا لگتا ہے جیسے میرے منھ پر تھپڑ مار رہی ہو۔''

''تم جھوٹے ہو، میری ماں کبھی ایسا نہیں کرتی۔''

''ہاں، ہاں،'' وہ سر جھٹک کر بولا۔'' وہ تو شان دکھاتی ہے کہ اس کے گھر میں ٹی وی ہے، تو بھی مجھے اسی لیے بلا رہی ہے۔''

موسیٰ کے یہ طنز اگر چہ کہ اس وقت بہت بری طرح مجھے مجروح نہیں کرتے تھے لیکن مجھے برے ضرور لگتے تھے۔ یہ آخر کیا بکتا رہتا ہے؟ لیکن موسیٰ کے اس طنز کے باوجود میں اپنے علاقے کے لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلتی تھی۔

میں جب گھر سے باہر نہا دھو کر نکلتی، میرے قدم خود بخود موسیٰ کو ڈھونڈھنے کے لیے چل پڑتے۔ جو صاف ستھرے بچوں اور اپنے علاقے کے بچوں سے الگ تھلگ دور کسی کونے میں چپ چاپ کھڑا کچھ تکا کرتا تھا۔ مجھے دیکھ کر موسیٰ کے چہرے پر چڑھی ہوئی اداسی کی تہہ پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ تیرنے لگتی اور میری وہ شام اس کی اس مسکراہٹ پر مجھے تازہ ہواؤں سے ملا دیتی۔

(۲)

میری اور موسیٰ کی دوستی بھی کچھ اسی طرح ہوئی تھی۔ اس شام اماں نے مجھے تاکید سے باہر بھیجا تھا،'' دیکھو باہر جاؤ لیکن ان گندے بچوں سے مت کھیلنا۔'' گندے بچے میرے لیے ایک عجوبہ ہو گئے تھے۔ بار بار کی تاکید نے مجھے ان گندے بچوں کی طرف آخر پہنچا دیا تھا۔

وہ پہلا بچہ موسیٰ ہی تھا جو مجھے اس طرف آتے ہوئے دیکھ کر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا تھا۔

''ارے تم ادھر کیوں آئی ہو، یہ تمھارا علاقہ نہیں ہے۔''

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ میدان میں کوئی ایسی لکیر نہیں تھی جو مجھے ادھر یا ادھر کا فرق بتا دیتی۔ میں غرائی، غصہ مجھے اکثر جلدی آ جاتا ہے۔ ''ہاں، تو لکیر کھینچ کر رکھو، تمھارا علاقہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔''

موسیٰ نے جھٹ اپنے ننگے پاؤں سے لکیر کھینچ دی۔

''یہ لو بس، اب تم ادھر رہو، اور یہیں سے ہی گھر کی طرف پھوٹ جاؤ۔''

میں اس کے اتنی جلدی کیے ہوئے فیصلے پر روہانسی ہوگئی۔ ''لیکن میں کیوں نہیں آؤں، تمھارے علاقے میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔''

یہ لفظ 'سرخاب'، اکثر اماں کو بولتے ہوئے میں نے سنا تھا۔ میں اٹک اٹک کر غصے میں بول رہی تھی۔ لیکن موسیٰ تڑ کا۔

''چل بھاگ ادھر، جہاں تیرے علاقے کے لڑکے لڑکیاں کھیل رہے ہیں۔ یہ ربن یہ جوتے اور یہ تیری چمکتی ہوئی فراک... '' اس نے ایک پتلی سی چھڑی سے جو اس کے ہاتھ میں پہلے سے تھی، میری فراک ربن اور جوتوں کو اپنے تئیں ٹھونکتے ہوئے کہا۔ ''چل بھئی، بھاگ ایسا ادھر کچھ نہیں ہے۔''

''تُو تو پاگل ہے،'' میں نے موسیٰ کو بہت غصے میں گھورتے ہوئے کہا۔

پہلی دفعہ کوئی چہرہ اتنے غور سے میں نے دیکھا تھا۔ میں اس وقت چھٹی کلاس میں پڑھ رہی تھی، مجھے بہت سی استانیاں بعض دفعہ گھڑک چکی تھیں۔ اماں ابا کی بھی کبھی کبھی جھڑکیاں پڑی رہتی تھیں لیکن اس لہجے میں، یہ لڑکا مجھ سے پہلی بار مخاطب ہوا تھا۔ اور پھر اتنا گندا۔ میرا خیال یہی تھا کہ گندے بچے ہمیشہ دب کر رہتے ہیں۔ اس کی اکڑ دیکھ کر غصے کے ساتھ ساتھ میرے دل میں جانے کیوں دھیمی سی خوشی اٹھ رہی تھی، لیکن ساتھ ہی میرا دل لڑنے کو بھی چاہنے لگا۔

''مٹاؤ اس لکیر کو۔ میں جہاں چاہوں گی لگاؤں گی،'' میں نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

وہ دھکا کھا کر پیچھے کی طرف لڑھکا، اور سنبھلتے ہوئے اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور پھر ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے بے حال سا ہو گیا۔ میں اس جوابی کارروائی کے لیے تیار نہیں تھی۔ مجھے تو یہ پتہ تھا کہ وہ سختی سے اپنا پاؤں اس لکیر پر رکھ دے گا، یا پھر مجھے دھکا دے گا۔ اس کی ہنسی سے میں پریشان ہو گئی تھی۔ میں اسے ہنستا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ کے لڑکے جو اس علاقے میں اسی جیسے گندے، اس کے اردگرد آ کر کھڑے ہو گئے تھے، پہلے تو اسے تکتے رہے پھر وہ بھی ہنسنے لگے ان سب کی ہنسی نے مجھے شرمندہ سا کر دیا۔

''کیوں ہنس رہے ہو؟'' میں چلائی۔

وہ ہنسی ختم کر کے مجھے دیکھنے لگا۔

''تم نے وہی کیا جو تمہارے علاقے کے بڑے لوگ ہمارے ساتھ کرتے ہیں۔ تم اتنی چھوٹی سی تو ہو اور دھکا بڑوں کی طرح دیتی ہو، اتنی جلدی سیکھ گئیں یہ سب کچھ۔''

مجھے اس کی باتیں اپنے تمام تر معنوں کے ساتھ سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ لیکن موسیٰ کا چہرہ یہ ساری باتیں کرتے ہوئے مجھے گندہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اور چمک رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں، گھونگریالے بال اور تیکھی نوکیلی ناک، میں غور سے دیکھ رہی تھی۔

ایک دم میرا دل اس سے دوستی کرنے کو چاہا، میں نے وہ لکیر جلدی سے اپنے سفید پالش کیے ہوئے جوتوں سے مٹا دی۔

''دوستی کرو گے؟'' اپنی دو انگلیاں ملا کر میں نے ہونٹوں سے لگائیں اور اس کی طرف بڑھا دیں۔

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے گھورا، پھر آہستہ سے اپنی دوستی والی انگلیاں اپنی کمر سے اس طرح صاف کیں جیسے چھری کو تیز کرتے ہوئے کسی پتھر یا زمین پر رگڑتے ہیں، اور اپنی سمٹی ہوئی دو انگلیوں کو میری طرف بڑھایا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ انگلیاں موسیٰ کی نہیں تھیں، وہ تو میری انگلیاں تھیں۔ میں نے اپنے ہی لمس کو اس کی

انگلیوں میں محسوس کیا تھا۔

''تمھارا نام کیا ہے؟''

''موسیٰ'' اس نے گریبان کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

میرا نام اسکول میں اماں نے یہ لکھایا تھا، میں نے بھی اسکول میں پکارے جانے والا نام اسے بتایا۔

''تمھارے دو نام ہیں'' اس نے منہ آگے کی طرف کر کے پوچھا۔

''نہیں! ابا مجھے گھر میں پیار سے پکارتے ہیں۔'' میں نے گھر کا نام بھی بتا دیا۔

''چلو ٹھیک ہے دیکھیں گے کون سا نام پکارنے میں اچھا لگتا ہے۔'' میں ہنسنے لگی۔ مجھے یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔ وہ سارا واقعہ میرے ذہن میں آج بھی ازبر ہے۔ اگرچہ کہ وہ نقش نہیں کھینچ پا رہی ہوں، جو موسیٰ کے چہرے سے اٹھ کر میرے حواسوں پر نقش ہو رہا تھا۔

(۳)

کچھ چیزیں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں، لیکن پھر بھی ان میں سے کچھ کو میں بھول جاتی تھی۔ کچھ ایسی ہوتی تھیں جو دیر تک یاد رہتی تھیں جیسے اپنے باپ کے کندھے پر بیٹھ کر سمندر دیکھنا۔ سمندر مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ کبھی کبھی تو ہوک سی اٹھتی تھی اور میں ابا کی ٹانگوں سے لپٹ کر ضد کرتی کہ مجھے سمندر پر لے چلیں۔ میں ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ لہذا وہ میری زیادہ سے زیادہ فرمائش پوری کرنے پر مجبور ہوتے۔ اکثر وہ مجھ سے ایسی باتیں کرتے جو مجھے اس دنیا سے باہر لے جاتیں جو اماں کی دنیا ہوتی۔ اماں تو مجھے ہر وقت اس طرح دیکھتیں تھیں جیسے میں ان کی کوئی قیمتی شے ہوں، جسے انھیں سنبھال کر رکھنا ہے۔ وہ میرے کپڑوں لتوں کے ساتھ ساتھ میرے لیے خواب بھی دیکھتیں تھیں۔

جب وہ میرے پاس لیٹی ہوتیں، تو کہتیں: ''جب تو بڑی ہوگی تو میں تیرے لیے ہیروں کا سیٹ بنواؤں گی، تجھے دھوم دھام سے بیاہوں گی، اور تجھے اتنا جہیز دوں گی

کہ۔۔۔"

میں جہیز، دھوم دھام اور ہیرے کے سیٹ سے مانوس نہیں تھی لہٰذا ان کی بہت سی نصیحتوں کی طرح میں ان خوابوں کو بھی ایسے ہی سنتی، جیسے وہ مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہوں۔

لیکن ابا مجھے سڑک پر چلتے ہوئے، سمندر پر ٹہلاتے ہوئے عجیب عجیب باتیں کرتے۔" دیکھو یہ آسمان جو ہے اس کا کوئی کنارہ نہیں ہے یہ انسانوں کے خوابوں جیسا ہے اور یہ سمندر جو آسمان سے مل رہا ہے، وہاں، وہ دور۔ "وہ اشارہ کرتے اور میں اس اشارے کی طرف اپنے پنجوں کے بل اونچی ہو کر دیکھتی، "وہ کبھی نہیں ملتا، بس ہمیں نظر آتا ہے۔"

میں بھی ابا سے بے اندازہ سوالات کرتی جاتی۔ کسی کا جواب وہ دیتے اور کسی کا نہیں دے پاتے۔ اس عرصے میں مجھے بھی جو یاد رہ گیا ہے میرے احساس کا حصہ ہے، ایسے ہی جیسے موسیٰ کے چہرے کے نقوش جو پہلی بار میری آنکھوں میں اترے تھے۔

میں جب اس میدان سے واپس ہو رہی تھی تو دل میں پہلی بار دیر سے گھر لوٹنے کا خوف تھا۔

میں نے موسیٰ سے کہا، "اپنی لکیر سے ادھر آ جاؤ اور میرے ساتھ چلو۔"

میدان میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس نے اچک کر لکیر پار کی جو میں پہلے ہی مٹا چکی تھی۔ اور میرے ساتھ ننگے پاؤں ہی گھر تک پہنچا۔ باہر دروازے سے لگی میری ماں کھڑی تھی۔ اماں موسیٰ کو دور سے آتے دیکھ چکی تھیں۔

"یہ تمھارے ساتھ کون ہے؟" اماں نے حقارت سے اچٹتی سی نظر ڈالی۔

میں نے موسیٰ کو دیکھا۔ موسیٰ بے خوفی سے اماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کون ہے یہ؟" اماں نے زور سے پوچھا۔

"اماں یہ موسیٰ ہے، وہاں رہتا ہے۔" میں نے انگلی کے اشارے سے ان جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کیا، جہاں وہ رہتا تھا، جواب دور سے ٹمٹماتے ہوئے جگنوؤں کی

طرح اندھیرے میں نظر آ رہی تھیں۔ اماں نے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے اپنی طرف گھسیٹا۔

''شام ہو رہی ہے، دونوں وقت مل چکے ہیں۔تم نے اتنی دیر کہاں کردی؟''

میں نے دیکھا، موسیٰ واپسی کے لیے قدم بڑھا چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ واپس لوٹ رہا تھا۔ پہلی بار مجھے اماں اچھی نہیں لگیں۔ انھوں نے موسیٰ کو اندر آنے کے لیے نہیں کہا۔ موسیٰ تو میرا دوست بن چکا تھا۔ حالانکہ جب میری کلاس کا کوئی لڑکا یا لڑکی میرے گھر آتے تو اماں خوب آؤ بھگت کرتی تھیں۔آخر مجھ سے ضبط نہیں ہو سکا۔

''اماں تم نے موسیٰ کو اندر آنے کے لیے نہیں کہا۔''

''وہ، اس گندے لڑکے کو،تم اس کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ اس کے پاؤں میں جوتی تک نہیں تھی۔ اور دیکھا تم نے کتنے گندے پاؤں تھے اور کپڑے، کپڑوں سے بدبو آ رہی تھی۔''

میں ان کو جیسے ایک ہی سانس میں بولتے ہوئے دیکھ رہی تھی، اور سوچ رہی تھی اماں نے اندھیرے میں موسیٰ کا چہرہ نہیں دیکھا ہوگا۔ اپنے تھکے قدموں سے میں پھر اماں کے پیچھے پیچھے گھر کے اندر آ گئی۔

اماں اس دن دیر تک نصیحتیں کرتی رہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ مت کھیلو، ان سے مت ملا کرو، ان لوگوں کی عادتیں اچھی نہیں ہوتیں، یہ اول فول زبان استعمال کرتے ہیں لالچی ہوتے ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ اور میں اس دوران سوچتی رہی اماں ایسا کیوں کہہ رہی ہیں، اماں کو ایسی کون سی بات موسیٰ کی بری لگی۔ جب کہ راستے بھر موسیٰ نے ایسی کوئی زبان نہیں استعمال کی جو مجھے بری لگی ہو۔

اور میں دیر تک اس بالکونی میں کھڑی رہی جہاں دور سے مجھے وہ میدان اور اس کے کونے میں وہ جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں، جن کے قریب دن میں دھول اُڑتی رہتی تھی لیکن رات میں ان کے اندر جلنے والی لالٹینیں دور سے اندھیرے میں کہیں کہیں سے جھانکتی ایسی نظر آتی تھیں، جیسے ننھے ننھے چراغ ہوا میں جل بجھ رہے ہوں۔ میں وہاں دیر

تک کھڑی رہی اور سوچتی رہی موسیٰ ان میں سے کسی ایک جھونپڑی میں موجود ہوگا، وہ جو میرا نیا نیا دوست بنا ہے۔

اماں کی نصیحتیں کام نہیں آئیں۔ موسیٰ سے میرا میل جول بڑھنے لگا۔ میں نے اسکول سے آنے کا وہ راستہ اختیار کیا، جہاں سے موسیٰ کا علاقہ قریب تھا۔ میں اکثر اسی راستے سے آتی اور موسیٰ سے میری ملاقات اکثر ہوتی۔ موسیٰ بھی شاید میرے ہی انتظار میں کھڑا ملتا۔ اس کے چہرے پر چڑھی ہوئی اداسی کی تہہ پر مجھے ایسا لگتا کہ مجھے دیکھ کر اس پر موہوم سی مسکراہٹ آ جاتی۔ ہم دونوں دیر تک اس میدان کا چکر لگاتے اور باتیں کرتے۔ وہ باتیں، جو موسیٰ کرتا وہ میرے لیے نئی نئی ہوتیں۔ مجھے اچنبھے میں ڈالتی جاتیں۔ جنہیں میں بعد میں دل ہی دل میں دہراتی اور یاد رکھنے کی کوشش کرتی۔

لیکن جب میں، اس وقت پر جو اسکول سے پہنچنے کا ہوتا گھر نہیں جاتی، تو اماں بلبلا اٹھتیں۔ اور دیر تک مجھے اپنی نصیحتوں کی زد میں رکھتیں۔

(۴)

میدان کے اس کونے میں جہاں موسیٰ اپنی چھوٹی انگلی سے زمین کھود رہا تھا وہاں ایک چھوٹا سا گڑھا بنتا جا رہا تھا۔ موسیٰ ہمیشہ جب کچھ نہیں کر رہا ہوتا تو اس گڑھے کو کھودنے بیٹھ جاتا۔

آج بھی موسیٰ گڑھا کھود رہا تھا اور میں اس سے چندرا چندرا کر سوال کر رہی تھی۔

''تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس جگہ خزانہ ہے۔''

مجھے یقین تھا کہ موسیٰ میرے سوال کا جواب نہیں دے پائے گا لیکن اس نے اپنی ناک قمیض کے دامن سے پونچھتے ہوئے سر اٹھایا اور اپنی سفید سفید آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر غرّایا۔

''جس خزانے کی مجھے تلاش ہے وہ اسی زمین کے نیچے ہے۔'' اس نے ان لفظوں

کو چبا کر کہا۔

''لیکن تم کیا کرو گے اس کا؟''

''میں، میں اس خزانے سے اپنے علاقے کی جھونپڑیاں تڑوا کر پکے گھر بنواؤں گا، اور ایک اسکول، جہاں میرے علاقے کے بچے مفت پڑھا کریں گے۔ انہوں نے اسکول کی شکل نہیں دیکھی ہے۔ میں اتنا خزانہ نکال لوں گا، کہ روز کام پر جانے والے لوگ، جنھیں جب کام نہیں ملتا، تو ان کے بچے بھوکے سوتے ہیں، میں انھیں پیسے دوں گا اور۔۔ اور ایک ہسپتال بنواؤں گا جہاں میرے علاقے کے لوگ جب بیمار ہوں گے تو جائیں گے۔ وہاں ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں ہو گا جو اب سرکاری ہسپتالوں میں ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ ہسپتالوں کے عملے کی بے دردی اور بے رحمی کے ہاتھوں نہیں مریں گے۔''

میں نے اس سے پوچھا بھی تھا، کیا سچ ایسا ہوتا ہے۔ وہاں کوئی ایسا نہیں ہوتا جو ان کو مرنے سے بچائے۔

''نہیں۔ وہ غریبوں کو اس حالت میں اس طرح دیکھتے ہیں جیسے سڑک پر کسی کتے کو۔ جب بڑی ہو جانا تو ضرور جانا۔ وہاں ڈاکٹر بھی غریب مریضوں کو سسکتا ہوا دیکھ کر منھ موڑ لیتے ہیں۔ مریض ہسپتال کے چکر لگا کر ہی مر جاتا ہے۔''

موسیٰ اب ٹہلنے لگا تھا۔ میرے حساب کے ٹیچر کی طرح اس کے ہاتھ پیچھے کمر سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں دور خلا میں کچھ گھور رہی تھیں یا ہسپتال بنتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

کچھ دیر وہ سر جھکا کر خاموشی سے ٹہلتے گیا۔ اور میں اس کے ادھر سے ادھر ہوتے ہوئے قدموں کی دھمک سن رہی تھی جو اس کے پاؤں میں جوتا نہ ہونے کے باوجود ایسی تھی جیسے اس نے وزنی جوتے پہنے ہوں۔ اس کا چہرہ، شاید دھوپ کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنے ارادوں کی کھلبلاہٹ سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

''دیکھو۔'' وہ پھر بولا، ''میرے علاقے کے لوگ جب بیماری سے مر رہے ہوتے

ہیں تو انھیں سرکاری ہسپتالوں میں لاوارثوں کی طرح پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ اپنا علاج میرے پیسے سے کروائیں گے۔''

میں حیرت سے منھ کھولے موسیٰ کے شان دار کارنامے سن رہی تھی جو وہ اب کرنے جا رہا تھا۔ لیکن اس وقت، جب وہ سارا خزانہ اسے مل جائے گا، جسے وہ چھوٹی انگلی سے کھود کر نکالے گا۔

میرا دل دکھی ہونے لگا۔ ''موسیٰ، پھر تم اس کو رسان، رسان کیوں کھود رہے ہو، کہیں سے پھاوڑا لاؤ، میں بھی تمھارا ساتھ دوں گی۔''

''نہیں بے وقوف، یہ خزانہ ایسے ہی نکلتا ہے، اسے نکالنے میں بہت وقت لگتا ہے، اور اگر کسی اور کو معلوم ہو گیا تو وہ اس خزانے کو اُڑا کر لے جائیں گے، یا پھر روک دیں گے۔ کون چاہے گا کہ ہماری زندگیاں تبدیل ہوں۔''

میں دیکھ رہی تھی کہ موسیٰ کے چہرے پر جو سنجیدگی تھی وہ اس کی عمر کے کسی بھی لڑکے میں مجھے کبھی نظر نہیں آئی۔ وہ بولتے ہوئے کچھ کچھ ابا کی طرح نظر آ رہا تھا۔ ابا کی بھی اکثر باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں جس طرح موسیٰ کی آج کی باتیں میں سمجھ نہیں پا رہی تھی لیکن میرے دل میں کچھ عجیب سا ہونے لگا تھا، ایسے جیسے ہوا کے جھکڑ چل رہے ہوں کہیں دور، اور ان کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی ہوں۔

''موسیٰ، پھر تو یہ خزانہ بہت دیر سے نکلے گا'' میں نے بے تابی سے کہا۔ ''جب تک تم بوڑھے بھی ہو جاؤ گے اور پتہ نہیں میں کہاں ہوں۔''

موسیٰ دوبارہ مٹی کھودنے بیٹھ گیا تھا، اور اس مٹی جھاڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا، ''کوئی دوسرا یہ کام شروع کر دے گا۔ آخر تبدیلی تو آنی ہے، کیا ہم ہمیشہ ایسی ہی زندگی گزاریں گے؟، کبھی تو میرے جیسے لوگوں کے پاؤں میں جوتے بھی ہوں گے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے پاؤں کی طرف گھورا، جو پہلے سے زیادہ زخمی اور میلے نظر آ رہے تھے۔

دوسرا باب

(۱)

موسیٰ سے ملنے سے پہلے زندگی ایک ملائم بستر کی طرح تھی، جو میری ماں روز میرے کمرے میں نئی نئی چادریں بچھا کر ہموار کرتی تھی اور اس صحن کی طرح جس کو روز دھویا جاتا تھا، جس کے چاروں طرف لگی کیاریوں میں رنگ برنگے پھولوں سے مہک اٹھتی رہتی تھی۔

صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا میری ماں مجھ سے پوچھ پوچھ کر پکاتی تھی، اور بہت اہتمام سے سجا کر مجھے کھلایا جاتا تھا۔ ہر وقت جوس سوپ اور نت نئی مٹھائیاں اور پھل مجھے کھلانے کے لیے میری ماں میرے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھی۔

میری الماری رنگین فراکوں سے بھری ہوئی تھی، جوتوں کا ایک انبار تھا جو میری ماں میرے لیے لا لا کر ڈھیر کرتی رہتی تھی اور رات کو سونے سے پہلے بادشاہوں، شہزادوں اور پریوں کی کہانیاں، جنھیں سن کر میں زندگی کو اس قوس قزح کی طرح جان رہی تھی جو بارش کے بعد مجھے اپنی کھلی چھت سے آسمان پر پھیلی نظر آتی تھی، جو ماں مجھے روز سونے سے پہلے اپنی عادت سے مجبور ہو کر سناتی تھی، یا پھر باپ کی باتیں جو زندگی کے کسی ایسے رُخ کو بیان کر رہی ہوتیں جنھیں کھوجنے کے لیے ابھی وقت پڑا تھا۔

لیکن موسیٰ سے دوستی کے بعد زندگی باسی روٹی کی طرح نظر آنے لگی تھی، جو ماں روز ایک کونے میں رکھ دیتی تھی جو ہاتھ لگاتے ہی کڑک سے ٹوٹ جاتی تھی، جن میں کبھی کبھی پھپھوندی لگ جاتی تھی اور اس کو سونگھنے سے جی متلانے لگتا تھا۔

ماں مجھ سے کہتی رہتی تھیں، ''تم پڑھ لکھ جاؤ، زندگی پڑھنے لکھنے سے سمجھ میں آنے لگتی ہے'' اور میں سوچ رہی ہوتی، موسیٰ کو کچھ پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

میرے علاقے کے سب لڑکے لڑکیاں پڑھ رہے تھے میرے خاندان کے تمام بچے بھی، لیکن وہ تو کتنی بودی بودی باتیں کرتے تھے، ان کے نزدیک ابھی زندگی، نا قیاں،

چونگ گم اور مختلف مشروبات کھانے پینے کا نام ہی تھا۔ لیکن موسیٰ اسکول جائے بغیر کتنی بڑی بڑی باتیں کرتا تھا۔ ننگے پیر ہونے کے باوجود وہ اپنے پاؤں زمین پر ایسے رکھتا تھا جیسے وزنی بوٹ پہنے ہوئے ہو، ابھی کچل دے گا سب کو۔

اس کی آنکھوں میں ایک ایسی فضا ہوتی جیسے کوئی کسی دشمن کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہو۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ مجھے چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

ایک بار میں نے موسیٰ سے پوچھا تھا، موسیٰ تم کو پڑھنا آتا ہے؟ تو وہ ہنسنے لگا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو، صرف تم لوگوں کے نصیب میں ہی لکھنا پڑھنا ہے۔ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔''

مگر کیسے؟ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی، بغیر اسکول جائے کوئی کیسے لکھنا پڑھنا سیکھ سکتا ہے۔

''ہاں، میرے باپ نے مجھے اتنا سکھا دیا ہے کہ میں تمھاری کتابوں سے زیادہ اچھی کتابیں پڑھ لیتا ہوں۔''

اس وقت تک میں یہ جان گئی تھی کہ موسیٰ کے لہجے میں یہ تلخی اور غصہ کیوں پیدا ہوا۔ اس کے پاس کوئی نرم بستر نہیں تھا اور نہ اسے پیٹ بھر روٹی ملتی تھی۔ اس کی ماں سب کے حصے میں برابر روٹی تقسیم کر کے جو بچ جاتی تھی، وہ کھاتی تھی۔ وہ پانچ بھائی بہن تھے، اس کا باپ روزانہ کی آمدنی پر نوکر تھا۔ وہ کبھی کبھی موسیٰ کو ساتھ لے جاتا تھا، جب کارخانے میں کام زیادہ ہو جاتا تھا۔

موسیٰ اکثر کئی کئی دن مجھے نظر نہیں آتا تھا جب ملتا تو میں اس سے پوچھتی، ''موسیٰ تم کہاں تھے؟''

''میں، میں پیٹ بھر روٹی کے لیے محنت کرنے گیا تھا، وہاں گدھوں کی طرح کام لیتے ہیں۔ لیکن جو پیسے دیتے ہیں اس میں یہ مٹھی بھی نہیں بھرتی۔'' وہ اپنی ہتھیلی کی مٹھی بنا کر مجھے دکھاتا۔ ایسے وقت میں اس کا چہرہ رنج سے تلملایا ہوا لگتا تھا۔

''تم زیادہ پیسے کیوں نہیں مانگتے ہو؟'' میں اس کے رنجیدہ چہرے سے ملول ہو کر کہتی۔

''تو کیا ہوگا؟ وہ مجھے کام نہیں کرنے دیں گے، اس جگہ کسی اور کو کام پر رکھ لیں گے جو بھوک سے مجبور ہو کر اس سے بھی کم پر تیار ہو جائے گا۔''

''ارے!'' میرے منھ سے ارے ایسے نکلا جیسے کسی نے میری گدی پر انتہائی سردی میں برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہو۔

''ہاں، یہی ہوتا ہے، وہاں تو بھوکوں ننگوں کی ایک قطار لگی ہوتی ہے۔ ہر آدمی ہر دن اپنی قسمت آزماتا ہے اس دن اگر کام مل جائے، تو۔ ''

''تو؟'' میں نے اس طرح پوچھا جیسے کوئی پہیلی ہو۔

''تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ آج روٹی ضرور ملے گی۔'' اس نے اپنے ہونٹوں کو چبا کر اور آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر کہا، جیسے کوئی ہے میرے علاوہ جو اس کی سن رہا ہے۔

موسیٰ کی باتیں میرے دل میں کھولتے ہوئے گرم پانی کی بوندوں کی طرح گر رہی تھیں، اور اس کا ایک ایک لفظ مجھے ہر روز ایک نئے ملال کا راستہ دکھاتا تھا۔

(۲)

میں ایک رات ابا کے پاس لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے ابا سے پوچھا تھا، ''ابا ہمارے سامنے جو بستی ہے، اس میں رہنے والے لوگ کون ہیں، ان کی زندگی ہم سے مختلف کیوں ہے، یہ ہماری طرح زندگی کیوں نہیں گزار سکتے؟''

ابا کی آنکھیں ایک دم بڑی بڑی سی ہوئیں، حیرت ان میں تیرنے لگی تھی اور تشویش بھی، پھر وہ میرا چہرہ غور سے دیکھنے لگے۔ ''ہوں'' انھوں نے ایک عجیب سی آواز، ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے نکالی۔

طبقاتی تقسیم، میں نے اس لفظ کو اپنے ذہن میں یاد کرتے ہوئے، اسی طرح چبا کر سوال کی شکل میں دہرایا۔

''ہاں، امیر اور غریب کا فرق۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔''

''کیوں ابا؟'' میں اندر ہی اندر الجھنے لگی تھی۔

''اس کیوں کا جواب مشکل ہے۔''

''یہ فرق کون پیدا کرتا ہے؟'' اب میں بستر پر اچھل کر بیٹھ چکی تھی، اور اپنے گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر کمرے کی ملگجی روشنی میں ابا کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے پھر اپنا سوال دہرایا، ایک ایسی آواز میں جو ڈری ہوئی تھی کہ ابا نہ جانے اب کیا کہہ دیں، جو ناممکن ہو سلجھانے کے لیے۔

''ابا یہ فرق کون پیدا کرتا ہے؟'' ابا نے تکیہ پر سیدھے رکھے ہوئے سر کو گھما کر میری طرف دیکھا، جیسے مجھے کھوج کر وہ کوئی جواب دیں گے۔

''بس انسان، ہمارے تمھارے جیسے۔'' یہ کہتے ہوئے ابا کے چہرے پر کچھ نامعلوم ہونے کا احساس زیادہ تھا، وہ جانتے تھے کہ وہ مجھے مطمئن نہیں کر پا رہے ہیں۔

''لیکن ابا ان انسانوں کو کوئی روک نہیں سکتا؟''

''نہیں'' ابا نے نہیں اب اتنی زور سے اور سختی سے کہا کہ تھا کہ جیسے مجھے سوال کرنے سے روک رہے ہوں۔

''تو ابا کیا آپ اس تقسیم میں شریک ہیں؟'' میرا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا اور سوالوں کا ایک ریلا تھا جو میرے دماغ میں ہلچل مچا رہا تھا، مجھے یقین تھا ابا اس میں شامل نہیں ہیں۔

''پتہ نہیں، ہو سکتا ہے مجھ سے بھی کوئی غلطی ہو رہی ہو۔'' ابا نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

''وہ کیسے؟'' اور میں دکھ سے سوچ رہی تھی کہ ابا بھی اس جرم میں شامل ہیں۔ اور

ابا شاید اپنی صفائی میں کچھ کہہ رہے تھے۔
"لیکن یہ سب تمھاری سمجھ میں جب آئے گا جب تم بڑی ہو جاؤ گی اور لکھ پڑھ جاؤ گی، تو خود بخود یہ باتیں تمھاری سمجھ میں آجائیں گی۔"
اس رات میں بہت بے اطمینان نیند سوئی تھی۔

(۳)

ایک دن موسیٰ اسی کونے میں بیٹھا مٹی کھودتے ہوئے نظر آیا تھا۔ میں چپکے سے اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ اور دیکھتی رہی دیر تک اس کو زمین کھودتے ہوئے۔ میں اب اس کی بے چارگی پر ترس کھا رہی تھی، موسیٰ کو پتہ نہیں تھا کہ ایک طبقاتی تقسیم بھی ہوتی ہے جس نے اس کا اور اس کے علاقے کے لوگوں کا یہ حشر کیا ہوا ہے۔ اس وقت میں اس تقسیم کو کوئی منصوبہ سمجھ رہی تھی جو کچھ انسانوں نے دوسرے انسانوں کے لیے بنایا تھا تاکہ وہ غریب رہیں۔ میں ہوا سے ہلتی فراک کو سمیٹ کر موسیٰ کے سامنے زمین پر بیٹھ گئی۔ موسیٰ نے میرے ہونے کی کوئی پرواہ نہیں کی، وہ انہماک سے زمین کھودنے میں جتا ہوا تھا۔
"موسیٰ" میں نے پکارنے کی آواز میں اس کا نام لیا، تاکہ وہ مجھے دیکھ لے۔
"موسیٰ یہ سب فضول ہے،" میں موسیٰ کو یہ بری خبر سنا دینا چاہتی تھی، اور یقین دلانا چاہتی تھی کہ اس کی حالت اب بھی سدھر نہیں سکتی۔
"کیا فضول ہے؟" اس نے چھوٹی انگلی سے، جو زمین کھود کھود کر اب سرخ اور آگے سے سخت اور سیاہی مائل ہو چکی تھی، مٹی جھاڑ کر پوچھا۔
"یہی کہ یہ طبقاتی تقسیم ہے۔"
"وہ کیا ہوتی ہے؟" اس نے دھوپ سے چندھیائی آنکھوں کو میچے میچے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''امیر اور غریب کا فرق، اور یہ کہ تمھارے پاس کبھی پیسے نہیں ہوں گے، یہ ایک بہت بڑا منصوبہ ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔'' یہ بتاتے ہوئے میرے منھ سے یہ الفاظ ابا کی طرح نکل رہے تھے۔

''کیا بک رہی ہو،'' اس نے اپنے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر کہا۔

''ابا نے بتایا۔''

''ہوں، تو تمھارے ابا جانتے ہیں یہ سب۔''

''کیوں نہیں جانتے؟'' میں نے کھسیانی آواز نکالی۔

''بہت سے تو یہ سب بھی نہیں جانتے،'' اس نے پاؤں سے مٹی اڑا کر کہا۔ ''میرا باپ اٹھارہ گھنٹے کی محنت کا معاوضہ دو گھنٹے کی محنت کے برابر لیتا ہے۔ اگر اسے اٹھارہ گھنٹے کی محنت کا معاوضہ مل جاتا تو ہم کبھی غریب نہیں ہوتے۔ یہیں سے شروع ہوتی ہے یہ تقسیم۔'' وہ سامنے درخت پر بیٹھی چڑیوں پر ننھا سا پتھر پھینک کر بولا۔

لیکن میں اس ناانصافی سے بوجھل ہو رہی تھی جو موسیٰ کے لفظوں نے مجھے سمجھائی تھی۔

اب مجھے معاوضے کا مطلب سمجھ میں آ گیا تھا۔ میں نے رسان سے موسیٰ سے پوچھا، ''پھر تم کو کتنا ملتا ہے یہ معاوضہ؟''

''مجھے، میں تو باپ کے ان گھنٹوں کو پورا کرنے کے لیے بلایا جاتا ہوں، جن میں وہ تھک کر بیٹھ جاتا ہے، یا جب وہ بیمار ہو جاتا ہے۔'' وہ اب بالوں پر ہاتھ ایسے پھیر رہا تھا، جیسے ان کو نوچ کر پھینک دے گا۔

اور میں اپنی چھوٹی انگلی سے اس زمین کو کھودنے لگی تھی، جس کا گڑھا ابھی ایک بالشت سے بھی زیادہ گہرا نہیں ہوا تھا۔ ''کیوں نہ ہم اس گڑھے کو جلدی جلدی گہرا کر لیں۔''

میرے لیے اب موسیٰ کی باتیں سن کر کوئی چارہ نہیں بچا تھا، موسیٰ کی اس حیثیت پر

میں اب صرف مایوس ہو رہی تھی۔

میں خوش بھی تھی کہ موسیٰ کو جلدی اس خزانے کی سوجھی تھی۔ اب اگر وہ یہ واقعی کھود لیتا ہے اور سچ مچ یہ خزانہ نکل آتا ہے تو موسیٰ بھی ایک بہتر زندگی گزارے گا۔ ''چلو موسیٰ تم کبھی نہ کبھی تو یہ خزانہ کھود نکالو گے، جس کی تم کو تلاش ہے۔'' میں نے زمین کھودتے ہوئے سر اٹھا کر موسیٰ سے کہا۔ موسیٰ ہنسنے لگا۔ شاید وہ میری بے خبری پر ہنس رہا ہو، اسے جو معلوم تھا، اس کا دکھ اس کی ہنسی میں شامل تھا۔

موسیٰ کے ساتھ کھیلتے ہوئے اور میدان میں اکثر گھومتے پھرتے باتیں کرتے ہوئے جہاں میرا وقت گزر رہا تھا، اور جو مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا، وہاں مجھے زندگی کی پیچیدگیوں سے بھی آگاہ کر رہا تھا۔ اور وہ سہولتیں جو ہر وقت مجھے مہیا تھیں، میں اب انہیں حیرت سے دیکھتی تھی اور ان کا موازنہ میں موسیٰ کی حالت سے کرتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں یہ سوچتے ہوئے اتنی بے چین ہو جاتی کہ اماں پریشان ہو جاتیں، وہ اب اکثر میری اس حالت کو غور سے دیکھتی تھیں۔

ایک دن میں نے اماں کو ابا سے کہتے سنا تھا ''تم جانتے ہو یہ اپنا زیادہ وقت نچلی بستی کے ایک لڑکے کے ساتھ گزارنے لگی ہے، اسکول سے آنے کے بعد اسے صرف اس کے ساتھ کھیلنے کی دھن سوار رہتی ہے، بہانے بہانے سے۔'' وہ اپنا ایک جملہ پورا کرتی تھیں اور اس کے تسلسل میں ہی دوسرا شروع کر دیتی تھیں۔ اور ابا نے اماں کے ہونٹوں کو مسلسل ہلتے ہوئے دیکھتے ہوئے سنا اور پھر بڑی دل جمعی میری طرف متوجہ ہوئے۔

''ہاں تو وہ لڑکا کون ہے؟ کیا نام ہے؟ کیا کرتا ہے؟'' ابا بھی اماں کی طرح تسلسل سے سوالوں پر آمادہ تھے۔ میں نے بچنے کوئی صورت نہ پا کر آخر ابا کو سب بتانے پر ہی اکتفا کیا۔

''ابا، وہ موسیٰ ہے، بے چارہ، وہ آپ اس دن بتا رہے تھے، طبقاتی تقسیم۔ اس کا

مطلب اس دن میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن موسیٰ نے مجھے بتا دیا۔''

میں موسیٰ کے تعارف کے ساتھ ساتھ ابا کو متاثر بھی کرنا چاہتی تھی، تاکہ ایک ہی وقت میں ابا سمجھ لیں کہ موسیٰ کوئی معمولی لڑکا نہیں ہے، جیسا کہ اماں سمجھتی ہیں۔ میں نے پھر بولنا شروع کیا۔

''میں اس سے اکثر کچھ نہ کچھ سیکھ لیتی ہوں۔''

''اچھا! تو وہ تم کو پڑھاتا ہے،'' ابا کے لہجے میں سوال بھی تھا اور اچنبا بھی۔ ''یہ تو بہت اچھا ہے۔'' اماں میری بے وقوفی پر نالاں ہو رہی تھیں۔ انھیں قطعاً یقین نہیں تھا کہ موسیٰ کوئی اچھی بات بھی کر سکتا ہے۔

''تو پھر کیا پتہ چلا تم کو، کیا بتایا اس نے طبقاتی تقسیم کے بارے میں؟'' ابا اب دلچسپی لیتے نظر آ رہے تھے، اور اماں کی باتوں کو نظر انداز کر رہے تھے۔

''ابا وہ کہہ رہا تھا، اس کے ابا کو محنت کی پوری رقم نہیں ملتی، وہ آدھی سے بھی آدھی ملتی ہے، اگر پوری ملنے لگے تو وہ سب پیٹ بھر کر روٹی کھائیں اور ہماری طرح آرام سے گزاریں۔''

ابا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ''کون ہے بھئی وہ، ہم کو بھی ملواؤ۔''

''وہیں انھیں جھونپڑیوں میں، جہاں ہر وقت گندگی ہے۔'' اماں نے پھر لقمہ دیا۔

''نہیں اماں، موسیٰ گندہ نہیں ہے'' میں تڑپ اٹھی۔ ''ابا آپ کہتے ہیں جو جھوٹ بولتا ہے اور دوسروں کو دھوکا دیتا ہے وہ گندہ ہوتا ہے، موسیٰ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔''

ابا اپنے کُرتے کے بٹن ٹھیک سے بند کرتے ہوئے مجھے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔

''کیا لکھتا پڑھتا ہے؟''

''پتہ نہیں، اسکول تو نہیں جاتا'' میں نے افسردگی سے کہا، ''شاید اس کا باپ اس کو پڑھاتا ہے۔''

امّاں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا، ''پاؤں میں جوتا نہیں ہے اسکول کہاں سے جائے گا۔''

ابا تاسف سے اماں کو دیکھنے لگے۔

''تو اس میں اس کا قصور تو نہیں ہے۔ نظام میں جب تک تبدیلی نہیں آئے گی یہ ظلم جاری رہے گا۔ پھر وہ اماں کی طرف دیکھ کر بولے، ''لڑکا ذہین ہے، باتیں سننے سے تو پتہ چلتا ہے۔''

''ہاں ابا، وہ بہت ذہین ہے،'' میں اب خوشی سے جھوم رہی تھی۔

ابا موسیٰ کی تعریف کر رہے تھے اور میں ابا کو بتا رہی تھی کہ موسیٰ کبھی کبھی ان کی طرح باتیں کرتا ہے اچھی اچھی

ابا ہنسنے لگے، ''اچھا تو تم کو میری باتیں اچھی لگتی ہیں؟'' وہ ہنستے ہوئے مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

اماں، میری اور ابا کی باتوں کے درمیان سے اب اٹھ کر چلی گئیں تھیں۔ میں دیر تک ابا کو موسیٰ کے بارے میں بتاتی رہی، ابا بہت غور سے سنتے رہے، پھر ایک لمبی آہ بھر کر بولے، ہاں بیٹا، انسان ایک عرصے سے اس چکی میں پس رہا ہے۔ اب یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔''

''لیکن ابا یہ کب تک ہوتا رہے گا،'' میں کسی حتمی نتیجے تک پہنچنا چاہتی تھی۔

''پتہ نہیں بیٹا، جیسے سمندر میں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھاتی رہیں گی، اس طرح۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور میں ابا کے آخری جملے کو یاد کرنے لگی، بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھاتی رہیں گی۔ واہ، میں ابا کو دل ہی دل میں داد دے رہی تھی۔ ابا نے کتنا اچھا جملہ کہا تھا، جب موسیٰ مجھے ملے گا میں اس کو سناؤں گی کہ صرف وہی بہت کچھ نہیں جانتا میں بھی بہت کچھ جانتی ہوں۔

اس دن میں چپکے سے دوپہر میں اسکول سے آنے کے بعد اس گڑھے کی طرف

چلی گئی تھی جو موسیٰ کھود رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہاں موسیٰ اس وقت نہیں ہوگا۔ میں موسیٰ کی مدد کرنا چاہتی تھی تاکہ گڑھا جلدی جلدی گہرا ہو جائے۔ دھوپ اس کونے کو جلا رہی تھی۔ میری انگلی اس زمین پر رکھتے ہی اس طرح جلی جیسے جلتے توے پر روٹی چھونے سے جل اٹھتی ہے۔ اس کھودے ہوئے گڑھے میں بھربھری مٹی بھری ہوئی تھی میں نے قریب سے ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھا کر اس مٹی کو نکالا اور مزید اس گڑھے کو گہرا کرنے لگی۔ گڑھا تھوڑا اور گہرا ہو گیا تھا لیکن میں زیادہ دیر تک وہاں نہیں ٹھیر سکی۔ گرمی اور دھوپ نے مجھے جلا سا دیا تھا۔ میں موسیٰ پر ترس کھاتی ہوئی اٹھی، کب تک موسیٰ یہ زمین کھودتا رہے گا۔ میں آہستہ آہستہ گھر کی طرف چل دی، ذرا دور جا کر میں نے پلٹ کر اس گڑھے کی طرف دیکھا۔ ہوا چل رہی تھی اور رہے سہے گڑھے کو اس کے آس پاس کی بھربھری مٹی دوبارہ بھرے دے رہی تھی، جو موسیٰ نے اور آج میں نے کھود کر چاروں طرف پھینکی تھی۔

ابا ایک شام مجھے سمندر کے کنارے ٹہلانے لے گئے تھے، وہ میری انگلی تھامے آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے۔ اور میں اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے بھاگ رہی تھی۔ ابا نے سمندر کی ہوا سے، جو ان کے منھ پر زور زور سے پڑ رہی تھی، اپنا منھ پھیر کر کہا، ''بٹیا، تمھاری ماں خاصی خفا ہو رہی تھیں۔ انھیں تمھارا موسیٰ کے ساتھ کھیلنا یوں اچھا نہیں لگتا۔ تم روز اس کے ساتھ مت کھیلا کرو۔''

میں ابا کے جملوں کو جو تیز ہوا میں میرے منھ پر پڑ رہے تھے اور گونج میں تبدیل ہو رہے تھے، سن رہی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو چھتری کی طرح بنائے ہوئے تھے جو ان کے چہرے کو ہوا سے بچائے ہوئے تھی۔ اور آج ابا کا چہرہ بھی معمول کے مطابق مجھے نظر نہیں آیا جو ہمیشہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ لیے ہوتا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی اماں نے اپنی باتوں سے ابا کو بھی اسی طرح سوچنے پر مجبور کر دیا ہے جس طرح وہ سوچ رہی تھیں۔ میں اب رک گئی، میرے قدموں کی آواز ابا نہ سن کر پلٹے، ''کیا ہوا، کیوں رک گئیں؟''

میں روہانسی ہو رہی تھی۔

میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا، ''میں کھیلتی نہیں ہوں، بس ہم دونوں باتیں کرتے ہیں۔'' مجھے اس کی باتیں سننا اچھا لگتا ہے، ہم دونوں میدان میں گھومتے ہیں اور وہ بولتا جاتا ہے میں سنتی رہتی ہوں۔ آپ میرے ساتھ ایک دن میدان میں چلیں، موسیٰ ایک بہت اہم کام کر رہا ہے۔''

''وہ کیا؟''

ابا اہم کام پر چونکے۔ ان کے قدم جو آگے کی طرف بڑھ رہے تھے، اب رک گئے تھے۔

''ابا وہ زمین کھود رہا ہے اپنی چھوٹی انگلی سے۔ خزانہ نکالے گا اور اس خزانے سے اپنی بستی کے لوگوں کی زندگی بدل دے گا۔''

ابا کے ہاتھوں کی چھتری کھل گئی تھی اور وہ حیران آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے، اب ان کے ہاتھ میرے شانوں پر تھے۔ وہ تھوڑی دیر مجھے دیکھتے رہے اور پھر سمندر کو اس طرح گھورنے لگے جیسے میری باتوں کا جواب اسے دیں گے۔ ''کیسے؟'' انھوں نے مجھے دیکھے بغیر کہا دیا۔

''وہ کہتا ہے وہ اسکول بنائے گا، ہسپتال اور لوگوں کے کچے گھروں کو پکا کرے گا۔''

''اور خزانہ کہاں سے آئے گا۔'' ابا اب بھی مجھے نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ ان آبی پرندوں کو دیکھ رہے تھے جو سمندر پر غول بنا کر اڑ رہے تھے۔ لیکن ان کے چہرے پر ایک عجیب وغریب مسکراہٹ تھی۔ ''کیا کوئی نقشہ اس کے ہاتھ لگا ہے؟'' ابا کی مسکراہٹ اب ہنسی میں بدل رہی تھی۔

''نہیں، اس نے سوچ لیا ہے کہ ایسا ہی ہوگا یعنی وہاں خزانہ ضرور ہوگا۔''

''تو کیا مزدور لگائے ہیں؟''

''نہیں، ابا وہ اپنی چھوٹی انگلی سے زمین کھود رہا ہے، کہتا ہے ایسا خزانہ آہستہ

آہستہ ہی نکلتا ہے۔''

ابا کے چہرے کا رنگ یک لخت بدل گیا تھا، ان کے چہرے پر اب افسردگی پھیل چکی تھی۔ ''اچھا، تو تم اس لڑکے کے ساتھ کھیلتی ہو۔'' ابا نے ''اس''، پر بہت زور دے کر جملہ پورا کیا۔ ''ٹھیک ہے ہمیں بھی ملانا۔ لیکن یہ سب اس نے سیکھا کہاں سے؟''

ابا سوال کر رہے تھے اور میں دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ ابا بھی موسیٰ سے مرعوب ہو رہے تھے۔

''یہی تو میں کہتی ہوں موسیٰ سے، کہ اس نے یہ سب کہاں سے سیکھا۔''

ابا نے میری تائید میں سر ہلایا۔ میں ابا کے قدموں کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش میں اب بھاگ رہی تھی، جو ایک بار پھر سمندر کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں سورج اب بالکل سمندر پر ٹکا ہوا تھا اور ساحل پر سرمئی رنگ گھل رہا تھا جس پر اڑنے والے پرندے اب سیاہ نقطوں تبدیل ہو رہے تھے۔

''لیکن زندگی بھی ایک اسکول ہی ہے۔ یہ بھی ہمیں بہت کچھ سکھا دیتی ہے، اور پھر کوئی اس سے سیکھنا بھی چاہے تو پھر تو وہ بہت کچھ سیکھ لیتا ہے''، ابا اب جیسے اپنے آپ سے ہی باتیں کرنے لگے تھے۔

پھر وہ رک کر میرے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگے، ''تم اچھا کرتی ہو اس کے ساتھ کھیلتی ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں تم بھی کچھ سیکھ رہی ہو۔''

''ہاں ابا، موسیٰ بہت پڑھا لکھا لگتا ہے۔ اماں بلاوجہ میں خفا رہتی ہیں۔''

''خیر، وہ اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ انھیں کیا معلوم موسیٰ پڑھا لکھا ہے۔''

''اور اماں نے اس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کی۔'' میں نے شکایتی اور دکھی لہجے میں ان سے کہا۔

''بھئی ان کی نظروں میں تو صاف ستھرا ہونا بھی ضروری ہے، تم موسیٰ سے کہو کہ صاف ستھرا رہا کرے۔''

''وہ کیسے ابا، اس کے پاس تو شاید ایک دو جوڑے کپڑے ہی ہیں۔ اس کے گھر میں پانی کا نلکا بھی نہیں ہے، کچھ بھی تو نہیں ہے۔ انھیں تو پینے کا پانی بھی بڑی مشکل سے ملتا ہے۔''

ابا ایک بار پھر چلتے چلتے رک گئے۔ ''تم کو کیسے پتہ چلا؟''

''میں نے ایک دن اس سے کہا تھا کہ صاف ستھرے رہا کرو، وہ بھڑک اٹھا تھا، کہہ رہا تھا ہمارے حصے کا پانی تم لوگ لے لیتے ہو، اپنے بڑے بڑے لان کے پودوں کو پانی دیتے ہو، ہمارے پاس آتے آتے پانی ختم ہو جاتا ہے۔''

ابا نے تفکر سے سر ہاں میں یا نہ میں ہلایا، یہ مجھے اندھیرے میں نظر نہیں آیا۔

''اور ابا وہاں پانی اور بجلی بھی نہیں ہے۔''

ابا ریت میں پاؤں دبا دبا کر چل رہے تھے، اور ان کی مدھم آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ میں بھی ابا کی طرح ریت کو پاؤں سے دبا دبا کر چل رہی تھی اور ابا کو کہتے سن رہی تھی: ''ہاں، وہ جگہ بستی کے لیے نہیں ہے وہ شاید کسی سرکاری عمارت کی ہے، یہ لوگ اس پر بسے ہوئے ہیں۔'' ابا کی آواز میں غصہ تھا، لیکن مدھم اور نیچے سروں میں، مجھے پتہ نہیں چل سکا۔ مگر میں اداس ہو رہی تھی۔ شاید کسی دن یہ یہاں سے بھی اٹھا دیے جائیں۔'' ابا اپنی باتوں سے میرے دل کو دہلا رہے تھے۔ میں چلتے چلتے رک گئی۔ ابا کے آخری جملے نے تو میرا دل جیسے اچھال کر سمندر میں پھینک دیا تھا۔ ابا کو پتہ ہی نہیں چلا کہ میری کیا حالت ہوئی، مجھے رکا دیکھ کر ابا پلٹے۔ اس وقت ابا ملگجی روشنی میں ایک ایسے سایے کی طرح نظر آئے جس کی آواز مجھے ڈرا رہی تھی۔

''اب چلو! رک کیوں گئیں۔''

میں نے ابا کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا اور بات وہیں سے شروع کی، ''لیکن کیوں اٹھا دیے جائیں گے؟''

''بھئی یہ بے گھر لوگ ہیں، جہاں خالی جگہ دیکھی، سر چھپانے کے لیے لکڑیاں

کھڑی کیں اور چھت ڈال لی، اور بس، پھر انھیں گھر کہنے لگتے ہیں، حکومت اگر چاہتی ہے تو انھیں دے دیتی ہے ورنہ...''

''ورنہ، ورنہ کیا؟'' میں ابا کے ساتھ قدم ملا کر چل رہی تھی کہ کہیں تیز ہوا میں کوئی لفظ میرے کانوں میں پڑنے سے رہ نہ جائے۔

''ورنہ انھیں کہیں اور پھینک دیا جاتا ہے،'' ابا یہ کہتے ہوئے اپنے قدموں کو اس طرح آگے بڑھانے لگے جیسے مجھ سے منھ چھپا رہے ہوں۔

اور میرا دل اب ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح تھا۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ ''ابا گھر چلیں:'' مجھے اب اپنا بستر یاد آرہا تھا، جس کے تکیے میں منھ چھپا کر میں رونا چاہتی تھی۔

(۴)

اس دن موسیٰ مجھے وہاں ملا جہاں وہ خزانہ نکالنے کی مہم پر لگا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس خاموشی سے جا کر کھڑی ہوگئی۔ اور غور سے موسیٰ کے گھونگریالے بالوں کو ہوا میں جھولتے ہوئے دیکھتی رہی۔ موسیٰ نے چہرہ اٹھا کر مجھے دیکھا، میرا دل ڈوب سا رہا تھا۔ موسیٰ نے اپنا کام ختم کیا اور کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہوا۔

''کیا بات ہے، تمھارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔ بیمار ہو؟''

''نہیں۔''

''پھر؟''

''کل ابا کے ساتھ سمندر پر گئی تھی۔''

''وہ تو تم جاتی رہتی ہو، کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔''

''نئی بات ہے،'' میں نے تلملا کر کہا۔ ''تم سنو گے تو''، میں نے تو......کو خوب کھینچا اور خود کو اس بات سے روکا کہ میں موسیٰ کو نہیں بتاؤں جو ابا کہہ رہے تھے۔

''ابا نے کچھ کہا؟ کہا ہوگا کہ تم میرے ساتھ مت کھیلو۔ مت کھیلو۔ جاؤ اپنے ان

دوستوں کے پاس جو تمھاری طرح شاندار کپڑے پہنے ہوتے ہیں۔ اور ہم تو بھئی ایسے ہی رہیں گے، تم کو ہمارے ساتھ کھیلنا ہے تو۔۔۔"

میں موسیٰ کو خاموش کرنے کے لیے، چیخ اٹھی۔ "بند کرو اپنی یہ بکواس۔ سنو ابا کیا کہہ رہے تھے۔ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں۔" یہ جملہ میرے ذہن میں جما ہوا تھا پھر موسیٰ کو سنانا بھی تھا۔ موسیٰ میری چیخ سن کر ابھی تک کانوں پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا، جھٹکے سے مڑا، "یہ بھی کوئی نئی بات ہے۔ جب سے دنیا بنی ہے یہ ہو رہا ہے۔"

مجھے یہ بات سن کر مزا نہیں آیا، نہ ہی مجھے برا لگا، ہاں میرا دل اداس ہو گیا، موسیٰ سب کچھ جانتا تھا۔ جبھی وہ ہر وقت کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

"ہاں تو اور کوئی نئی بات۔" موسیٰ جیسے جان گیا تھا کہ میں کچھ چھپا رہی ہوں۔

"چلو، میدان کی طرف چلتے ہیں، یہاں ہوا رکی ہوئی ہے، میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

موسیٰ کو یہ بتانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ موسیٰ سے یہ گھر چھین لیا جائے گا۔ وہ آگے آگے چلنے لگا۔ مجھے بتائے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ "موسیٰ، اگر یہ گھر تم سے چھین لیا جائے تو؟"

تو کے بعد میرے حلق میں جیسے کچھ پھنس گیا تھا۔ موسیٰ نے رک کر ایک پتھر کو زور سے اپنے پاؤں سے اچھالا، پتھر ہوا میں گھومتا ہوا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

"ہم لوگ اس پتھر کی طرح ہیں، پاؤں کی ٹھوکروں میں پڑے ہیں۔"

میں ڈر گئی۔ موسیٰ بات کو اتنا سمجھ رہا تھا۔

"یہ سب تو پہلے بھی ہوا ہے، ہمیشہ ہوتا آیا ہے ہوتا رہے گا۔"

اب میرے آنسو بہنے والے تھے۔ "تم اتنا کچھ جانتے ہو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ تم لوگ کبھی نا کبھی یہاں سے ہٹا دیے جاؤ گے۔"

''وہ تو ہے۔''

''پہلے ہم جہاں تھے وہاں سے بھی ہٹائے گئے تھے۔ وہاں میری ماں نے بہت اچھا سا ایک کمرہ بنایا تھا، ہمارے پاس سب کچھ تھا۔ باورچی خانہ بھی، میرے باپ نے اپنی محنت کی کمائی سے اس گھر کو بنایا تھا، کمرے میں بچھی چٹائی کو میں نے رنگا تھا، جو لالٹین کی روشنی میں بہت خوبصورت لگتی تھی۔ وہاں پانی کا بھی بہت اچھا انتظام تھا، ہمیں پانی یہاں کی طرح کم نہیں ملتا تھا۔ وہاں ایک اسکول بھی تھا جس میں میرے بہن بھائی پڑھتے تھے، وہاں مفت پڑھائی ہوتی تھی۔'' یہ جملے بولتے بولتے موسیٰ مجھ سے کئی قدم آگے نکل گیا تھا۔

''پھر''، میں نے پھر، موسیٰ کے کسی جملے کو جلدی سننے کے لیے بولا۔

''پھر......'' وہ گردن موڑ کر میری طرف دیکھنے لگا،'' میں بھی اسی اسکول میں جاتا تھا۔ اس اسکول کا ایک ٹیچر مجھ سے بڑی محبت کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا تم کو پڑھنے کا موقع ملتا رہا تو تم ایک دن اچھے آدمی بنو گے۔ لیکن ایک دن سب ختم ہو گیا۔ ہمارے گھر اکھاڑ دیے گئے اور ہمیں یہاں اتنی دور پھینک دیا گیا۔ میری ماں بہت دنوں تک اپنا وہ گھر یاد کرتی رہی جس کو اس نے محنت سے بنایا تھا۔ یہاں تو ہمارے سر پر صرف ایک چھت ہے، جو ہر موسم میں ہمیں تکلیف پہنچاتی ہے۔ میری ماں تمام دن پانی کے لیے دوڑتی پھرتی ہے۔ یہاں ہم جیسے لوگوں کے لیے قریب میں کوئی اسکول بھی نہیں ہے۔''

میں آگے کچھ سننا نہیں چاہتی تھی میرے قدم گھر کی جانب اٹھنے لگے۔ موسیٰ مجھے آوازیں دیتا رہ گیا۔

(۵)

ابّا اس رات برآمدے میں بیٹھے تھے۔ میں ان کے پاس اس تخت پر بیٹھ گئی، جس کو اماں نے بڑی ہنرمندی سے سجایا تھا اور جس پر رکھے گاؤتکیوں پر روپہلے گوٹے کا کام

دمک رہا تھا۔ میرے چہرے پر اس دن سے ہی ہوائیاں اڑ رہی تھیں جب سے میں نے ابا سے سنا تھا کہ کسی بھی وقت موسیٰ جہاں رہتا ہے اس بستی کو خالی کرالیا جائے گا۔ ابا نے میرا چہرہ دیکھ کر پوچھنا شروع کر دیا، ''کیا ہوا اماں نے کچھ کہا۔ کیا موسیٰ سے لڑائی ہو گئی۔'' ابا نے موسیٰ سے کونہیں دیکھا تھا لیکن وہ موسیٰ کے بارے میں اس طرح بات کرتے تھے جیسے بہت ملے ہوئے ہوں۔

''ابا، میں اداس ہورہی ہوں۔''

''کیوں بھئی؟''

''مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میری کوئی قیمتی چیز ٹوٹ گئی ہو۔''

''ارے !اتنی بڑی بات۔ تم کوتو واقعی میں موسیٰ سے دوستی رکھنا چاہئے۔ تم تو بہت عجیب باتیں کرنے لگی ہو۔ لیکن ایسا کیوں لگ رہا ہے؟''

''بس ابا، میرا دل دکھی ہو رہا ہے جب سے میں نے سنا ہے موسیٰ جس بستی میں رہتا ہے وہ بھی خالی کرالی جائے گی۔''

ابا سر ہلاتے ہوئے میرا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر بھی مجھے ملال نظر آیا۔ ''جاؤ، اماں کے پاس جا کر سو جاؤ۔''

''نہیں ابا، اماں ہمیشہ بادشاہوں کی کہانیاں سناتی ہیں جس میں محل، پریاں اور شہزادے شہزادیاں ہوتے ہیں۔ جن کی خدمت کے لیے بہت سے غلام اور کنیزیں ہوتی ہیں۔'' غلام، ابا نے غلام کہتے ہوئے تھوڑا سا منھ بنایا۔

''ہاں، ابا غلام... شاید یہ غلام بھی موسیٰ کی بستی جیسے ہوتے ہیں۔ جو محل میں ایک طرف رہتے ہیں۔''

ابا کو الجھن سا لگ رہا تھا۔ ''بس بس جاؤ، سو جاؤ، کیسی باتیں کرنے لگی ہو۔''

لیکن ابا شاید اس رات میری باتیں سن کر خوفزدہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے قریب کر کے تھپک کر سلانا چاہا تھا۔ لیکن میں نہ جانے کب تک اماں کی سنائی ہوئی

کہانیوں سے غلاموں کے قصے الگ کر کر کے یاد کرتی رہی، جو ہر وقت ایک جیسی حالت میں بادشاہوں کے حکم پر سر جھکا دیتے تھے۔ لیکن موسیٰ غلام نظر نہیں آتا ہے وہ تو ہر وقت غصے میں رہتا ہے، اس کے بس میں ہوتا تو وہ ان بادشاہوں کے سر اڑا دیتا جو غلاموں پر ظلم کرتے ہیں۔ میں دیر تک یہ سوچتے سوچتے سو گئی۔

مجھے اپنے اور موسیٰ کے فرق کا کبھی پتہ نہ چلا۔ وہ کیسے رہتا ہے، وہ کیا پہنتا ہے، وہ کہاں رہتا ہے۔ اماں کے بار بار یہ فرق سمجھانے کے بعد بھی مجھے موسیٰ صرف اپنا دوست نظر آیا جس سے باتیں کر کے میرا دل ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ میرے لیے اس وقت ان تمام باتوں کا جاننا بھی ضروری نہیں تھا کہ موسیٰ کی ماں اور اس کا باپ کیا کرتا ہے۔ ضروری تھا تو بس موسیٰ کے ساتھ گھومنا اور باتیں کرنا۔ موسیٰ جو باتیں کرتے ہوئے مجھے بہت بڑا نظر آتا تھا۔ اور اب تو اس کی آواز بھی بھاری بھاری سی لگنے لگی تھی۔ میں نے ایک دن موسیٰ سے کہا تھا موسیٰ تمھاری آواز پھٹے ڈھول کی طرح ہوتی جا رہی ہے۔

وہ ہنسنے لگا تھا۔ ''ہاں ماں کہتی ہے میں اب بڑا ہو رہا ہوں۔''

''تو کیا بڑے ہونے سے آواز بھاری ہو جاتی ہے۔''

پھر مجھے ابا کی آواز دھیان میں آئی، ہاں ہاں، ابا کی آواز بھی تو بھاری ہے۔ سب مردوں کی آواز بھاری ہو جاتی ہے جب وہ بڑے ہوتے ہیں۔ پھر میری تو نہیں ہوگی۔

''جب تم بڑی ہونے لگو گی تو تمھاری آواز بھی بھاری ہو جائے گی۔''

''توبہ، اتنی بری آواز میں تو میں نہیں بولنا چاہوں گی۔''

''تو کیا خاموش رہو گی؟'' وہ زور زور سے ہنس رہا تھا۔

میں اپنا مذاق اڑاتے ہوئے اسے ہنستا ہوا دیکھ رہی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ موسیٰ اس طرح دل کھول کر ہنستا ہو۔ وہ ہنستے ہوئے پھر بولا، تم پاگل ہو، عورتوں کی آواز ایسی ہی رہتی ہے، جب تم بڑی ہو جاؤ گی میری عمر جتنی تب بھی۔

اور میں موسیٰ کے ہنستے ہوئے چہرے کو آج غور سے دیکھ رہی تھی اس کے ہونٹوں کے اوپر ننھے ننھے چمکتے ہوئے بال اگ رہے تھے، اور ناک وہ تو اور لمبی اور نوکیلی ہو گئی تھی۔ میں نے موسیٰ کے ہونٹوں کو قریب سے دیکھا۔ موسیٰ منھ کھولے میری طرف دیکھنے لگا۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''تم واقعی بڑے ہو رہے ہو، ابا کی طرح تمھاری بھی مونچھیں اُگ رہی ہیں۔''

''چلو، چلو۔ بس کرو ریڈنگ۔''

''ریڈنگ؟''

''ہاں ہاں، فیس ریڈنگ۔ ایک تو تم اسکول میں پڑھنے کے بعد بھی نالائق ہو۔''

میں ہکا بکا رہ گئی۔ ''موسیٰ تم اتنا پڑھے ہوئے ہو۔''

''نہیں۔ میں تمھاری طرح جاہل ہوں، اسکول میسر نہیں ہوا تو کتابیں تو مل ہی جاتی ہیں۔''

میں اس دن بہت مایوس ہوئی، مجھے موسیٰ اپنے سے زیادہ پڑھا لکھا نظر آیا۔

ایک دن اس نے کھیل کے دوران مجھ سے پوچھا تھا تم اخبار پڑھتی ہو؟

''نہیں صرف ابا پڑھتے ہیں اخبار۔''

''جبھی تو تم جاہل ہو۔ ارے اخبار جو آدمی نہیں پڑھتا اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا، کیا ہو رہا ہے اس دنیا میں۔ خبریں پڑھا کرو روزمرہ کے واقعات سمجھ میں آتے ہیں۔''

''تم پڑھتے ہو؟'' میں اندر ہی اندر کھولنے لگی تھی۔ موسیٰ مجھ سے کئی ہاتھ آگے تھا۔

''اور نہیں تو کیا۔'' اس نے میلے پاؤں زمین میں رگڑ کر کہا۔

''اخبار نہیں پڑھوں گا تو اور کورا رہ جاؤں گا۔''

''اوہو! جبھی تم اتنی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو۔''

''بڑی بڑی باتیں؟'' اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

''ہاں، تمھاری کچھ باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں، کب پڑھتے ہو اخبار؟۔''

''جب کام پر جاتا ہوں۔ فیکٹری میں جب کھانے کا ٹائم آتا ہے، وہاں مزدوروں کے لیے ایک جگہ ہوتی ہے۔ ایک میز پر اخبار بھی ہوتا ہے، باقی تو سب کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میں اسی میں وقت نکال کر اخبار بھی پڑھ لیتا ہوں۔''

''حد ہوتی ہے تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں، میں بھی اخبار پڑھنا شروع کر دیتی۔''

''یہ باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں، تمھاری کھوپڑی میں یہ آنا چاہیے کہ اخبار کتنا ضروری ہے۔ اور روز کیا ہو رہا ہے۔ اور یہ کہ تمھارے گھر اور اسکول کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے۔''

''اچھا بس کرو۔'' میرا دل کھٹک رہا تھا، اپنے پر پیچ وتاب کھا رہی تھی موسیٰ اتنا پڑھ لیتا ہے۔

''تو میں جو پوچھ رہا تھا اس کی وجہ تھی۔''

''کیا؟''۔

''یہی کہ ہماری جیسی ایک بستی کو خالی کرانے کے بجائے اس میں آگ لگا دی۔ بہت سے لوگ جل گئے، اور باقی بے گھر ہو گئے۔''

میری ساری دُکھن جو موسیٰ کی قابلیت کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اچھل کر دوسری طرف جا پڑی۔ اب میں موسیٰ کی جھونپڑی کو جلتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور موسیٰ کا ایک اور جملہ میرے کانوں میں سیسہ انڈیل رہا تھا۔ شاید ہمیں بھی جلدی یہاں سے نکال دیا جائے۔ اچھا موسیٰ میں گھر چلتی ہوں۔ اب میں کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔

''بس گھبرا گئیں، یہی ہوتا ہے ہمیشہ ہمارے ساتھ۔ تم کو اب پتہ چلا۔'' وہ گھر کی طرف مجھے پلٹتا دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اور میں ایک ایسے عالم میں تھی جو خود مجھ پر واضح نہیں تھا۔

(۶)

اب میں نویں کلاس کا امتحان دے رہی تھی۔ موسیٰ کسی فیکٹری میں کام کر رہا تھا اسکول کی طرف جاتے اور آتے ہوئے میری اسکول بس موسیٰ کے علاقے کے قریب سے گزرتی تھی موسیٰ کی جھونپڑی کی طرف دیکھتی اور سوچتی موسیٰ اپنی ماں کے پاس کوئلوں کی انگیٹھی کے پاس بیٹھا چائے پی رہا ہوگا، اس کی ماں توے سے گرم گرم روٹی اتار رہی ہوگی اور موسیٰ وہ گرم گرم روٹی کھاتے ہوئے یا چائے کا گرم گھونٹ لیتے ہوئے اپنا منہ جلا بیٹھا ہوگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ہوں گے، پھر میں ہنسنے لگتی ہوں میری ہنسی کی تان ٹوٹتی ہے یہ سوچتے ہوئے کہ شاید ایسا کچھ بھی نہ ہو۔ اس کی ماں صرف پانی گرم کر رہی ہو اور موسیٰ اور اس کے بہن بھائی آج بھوکے ہی رہ گئے ہوں۔

موسیٰ کبھی کبھی میرے ساتھ میدان میں گھومتے ہوئے پوچھتا تھا رابعہ تم نے آج کیا کیا کھایا؟ میں ماں کا زبردستی اڑھایا ہوا ڈوپٹہ گردن سے کھولتے ہوئے صبح کے ناشتے کے اور دوپہر کے کھانے کے بارے میں سوچتے ہوئے کہتی آج ماں نے مجھے خوب ٹھنسایا ہے۔ دودھ پی لو، انڈا کھالو، ڈبل روٹی، مکھن، یہ، وہ۔۔۔ میں بولا جاتی ہوں۔ اماں گلے تک بھر دیتی ہیں۔ وہ میرا چہرہ منہ کھولے حیرت سے تکتا رہا، اس کی تیوریوں پر بل پڑنے لگے، اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک لمبی 'ہوں' کھینچی۔ اس کی ہوں پر میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔

''اوپر کیا دیکھ رہے ہو؟''

''بس خدا کی شان، تم کو اتنا کھلاتا ہے کہ تم اگلنے لگتی ہو۔ ایک ہم ہیں آج ماں نے صرف چولھا جلایا تھا، پکایا کچھ نہیں تھا۔''

''تو! تم اب تک بھوکے ہو۔''

''نہیں۔ کچھ تو کھایا ہے''

''کیا؟'' میں موسیٰ کی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی اس کی سیاہ پتلیوں کے اردگرد سفیدی کچھ اور بڑھ گئی تھی مجھے بھوک کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ صبح، دوپہر رات میرے لیے ماں نت نئے کھانے پکا پکا کر رکھتی تھیں ان کا اصرار رہتا دن بھر کھاؤ، قد بڑھنے کے دن ہیں، اور میں بھی کھائے جاتی۔

''جبھی تمہارا چہرہ کچھ اترا اترا لگ رہا ہے، جیسے جب کبھی اماں مجھے روزہ رکھواتی ہیں تب میرا ہوتا ہے۔''

موسیٰ جیسے تڑپ اٹھا۔ ''بس، بھوک کا سال میں ایک ہی تجربہ کرتے ہو تم لوگ۔''

میں مسوس سی گئی۔ ''تمہیں تکلیف ہو رہی ہوگی۔''

''ہاں ظاہر ہے۔ بھوکا ہوں۔ ماں نے کہیں سے آٹے کا انتظام کیا تھا۔ اسے گھول کر اس میں گڑ ملا کر پکایا تھا، پھر اسی سے سب نے پیٹ بھرا۔'' اس نے پاؤں میں پڑے ہوئے پتھروں کو زور سے اچھال کر اور لفظوں کو زبان کے نیچے رگڑ رگڑ کر کہا۔

جیسے یہ میرا قصور ہے کہ وہ بھوکا رہا ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسکول بس ایک جھٹکے سے رکی۔ تمام لڑکیاں اترنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میری دنیا محدود تھی۔ میری کسی سے موسیٰ جیسی دوستی نہ ہو پائی تھی، ماں کی بہت کوشش رہی کہ میں اپنے دوست بناؤں۔ لیکن میرے پاس فرصت نہیں تھی۔ اسکول سے واپسی کے بعد اماں کی سختی کے باوجود میں کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر تھوڑی دیر کے لیے باہر چلی جاتی موسیٰ یا تو اس کونے میں بیٹھا ہوتا جہاں وہ خزانہ نکالنے کے لیے اپنی چھوٹی انگلی سے زمین کھودنے میں جتا ہوتا، یا پھر کسی اور کونے میں میرے انتظار میں کھڑا ہوتا، اکثر تو یہی ہوتا کہ میں ہی اس کونے کی طرف چلی جاتی جہاں مجھے یقین ہوتا کہ وہ بیٹھا ہوا ملے گا، اور پھر باتیں، باتیں جو مجھے موسیٰ نت نئی سناتا، کبھی اپنی فیکٹری کے لوگوں کی کبھی ان لوگوں کی زندگی کی اس کے ساتھ اسی طرح پس رہے ہیں۔ لیکن ابھی تک میں اس

نتیجے تک نہیں پہنچی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور کب تک ہوتا رہے گا۔ لیکن میں اس غم میں موسیٰ کے ساتھ برابر کی شریک تھی جو گا ہے بگاہے مجھے کسی ناانصافی کی اطلاع دیتا رہتا تھا، جو اس کے جیسے لوگوں کے ساتھ ہو رہی تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور موسیٰ کے خزانہ نکالنے کی مہم مجھے ناکام ہوتی نظر آ رہی تھی۔ ابھی وہ گڑھا جو موسیٰ کھود رہا تھا صرف دو یا تین بالشت ہی کھدا ہوگا۔ شاید موسیٰ روز اس کو گہرا کرتا ہوگا لیکن میدان کی ہوائیں، اور وہاں چلنے پھرنے والے قدم روز اس کو پاٹ دیتے ہوں گے۔

اب تک مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ موسیٰ کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ لہٰذا ابا جب میرے لیے کوئی کتاب لاتے تھے میں موسیٰ کے پاس لے جاتی، وہ کبھی وہ کتاب پڑھے ہوتا اور کبھی مجھ سے لے کر پڑھتا لیکن کتاب کے بارے میں موسیٰ کی باتیں، مجھے موسیٰ کے ساتھ گھومنے اور باتیں کرنے پر کبھی وقت کے زیاں کا احساس نہیں ہوا۔ میں ابا سے جب موسیٰ کے کتاب کے بارے میں جو خیالات ہوتے بتاتی۔ ابا نہایت حیرانی سے مجھے سنتے، اماں ایسے وقت میں ابا سے کہتیں نظر آتیں اب اس کو کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں رہی سوائے ان کتابوں کے اور اس لڑکے کے ساتھ وقت ضائع کرنے کے۔ لڑکیوں والی کوئی بات نہیں رہی۔ اس سے پہلے کہ ان کا دماغ بالکل خراب ہو جائے ہمیں ہی یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔

میں اماں کی باتوں کا برا نہیں مانتی تھی مجھے معلوم تھا جس دن اماں موسیٰ سے خود ملیں گی اور اس سے باتیں کریں گی ان کا غصہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن ایسا موقع کبھی نہیں آیا پلک جھپک کر جیسے بہت سا وقت گزر گیا۔

وہ صبح اداس ہواؤں سے بھری ہوئی تھی۔ صبح اسکول بس میدان سے گزرتی ہوئی جب موسیٰ کے گھر کے قریب سے گزرنے والی سڑک پر پہنچی تو میں نے دیکھا وہاں کچھ بل ڈوزر ایک منحوس چال سے ادھر سے ادھر متحرک تھے، اور موسیٰ کی بستی میں اداسی اور بدنصیبی

کی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں جو دیکھ رہی تھیں وہ دل قبول نہیں کر رہا تھا۔ پہلے میرا دل چاہا کہ بس سے کود جاؤں، لیکن بس ایک زمانے سے اس علاقے سے نکل چکی تھی۔ اسکول میں میرا سارا دن بے چینی کی نظر ہو گیا تھا۔ وہ دن گزارنا، میرے لیے انتہائی دشوار تھا۔ میں سارا دن یہی سوچتی رہی کہ یہ واہمہ ہے۔ لیکن جوں جوں وقت گزر رہا تھا واہمہ خوف کی شکل اختیار کر رہا تھا۔

اسکول بس اب اسی راستے سے واپس جا رہی تھی۔ میں بالکل کھڑکی سے جڑی بیٹھی تھی اور اماں کی یاد کرائی ہوئی تمام دعاؤں کو دل ہی دل میں پڑھ رہی تھی لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں موسیٰ کی بستی کو اکھیڑا جا چکا تھا لوگوں کے بھاگنے، دوڑنے اور بلڈوزر کی آوازوں نے کچھ دیکھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا، ڈھول اور اس کے درمیان اٹھتا ہوا دھیما دھیما بین کرتا سا شور۔ اور تپتی ہوئی دھوپ۔ میرے پیٹ میں درد کے گولے سے اٹھ رہے تھے۔ میرے دل کا اندیشہ مجھے متلی پر اکسا رہا تھا۔ چاروں طرف اس میدان میں بستی کے لوگ اپنے اپنے سامان اٹھائے ہوئے بے چارگی کے عالم میں پھر رہے تھے۔ میں بس کا گھر تک جانے کا انتظار نہیں کر سکی۔ بس کو رکوا کر کود گئی۔ میں نے دوڑ کر موسیٰ کی جھونپڑی کا رخ لیا۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا اکھڑی ہوئی جھونپڑی اور ٹوٹے پھوٹے سامان کے ڈھیر کے سوا۔ میں ادھر ادھر بھاگتے ہوئے موسیٰ کو تلاش کرنے لگی لیکن اتنے بہت سے حواس باختہ، افراتفری سے گھرے ہوئے مجمع میں موسیٰ کو تلاش کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

میرا دل آج نئے غم سے آشنا ہو رہا تھا۔ وہ جیسے پانی میں بہتی کاغذ کی ناؤ کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہوں۔ بہت دیر تک میں اپنا بستہ کندھے پر ٹانگے ادھر سے ادھر بھاگتی رہی، پھر ایک کونے میں جا کر کھڑی ہو گئی کہ شاید موسیٰ مجھے تلاش کرتا ہوا یہاں آ جائے۔ میں دکھ کی دلدل میں دھنس رہی تھی، موسیٰ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا میں جلد اس ڈراؤنے خواب سے نکل جانا چاہتی تھی اور اس

بدحواسی سے کہ موسیٰ جا رہا تھا۔ لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں، اڑاتی ہوئی دھول کے درمیان بدحواس چہروں کو ایک دوسرے کو پکارتے ہوئے، تھوڑی دیر میں کھڑی رہی، پھر اچانک مجھے نہ جانے کیا ہوا میں بھی پکارنے والوں میں شامل ہو گئی میں موسیٰ کو چیخ چیخ کر آواز دی رہی تھی، جو اس بھیڑ میں گم ہو رہا تھا جن کو ڈھونڈا جا رہا تھا۔ لیکن میں صرف چیخی ہی رہ گئی۔ موسیٰ نے میری آواز نہیں سنی۔ موسیٰ وہاں نہیں تھا۔ دھول اور دھواں اب چھٹ رہا تھا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں گھر کی طرف بھاگی، یہ سوچ کر کہ بستہ رکھوں گی، پانی پیئوں گی اور واپس یہاں آ جاؤں گی۔ ہو سکتا ہے کہ موسیٰ مجھے ڈھونڈ رہا ہو۔

گھر میں گھستے ہی اماں نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ''بس تو کب کی آ کر چلی گئی تم کہاں تھیں؟'' میں نے اماں کے سوالوں کا جواب دیے بغیر ان سے سوال کرنا شروع کر دیے، اماں یہ گھر کیوں توڑے جا رہے ہیں۔

''یہ اسی قابل تھے، جہاں چاہتے ہیں گھر بنا لیتے ہیں۔''

اماں کے ہونٹوں کی بناوٹ جو ان جملوں کو بولتے ہوئے بن رہی تھی، میرے دل میں احتجاج پیدا کر رہی تھی۔

''اماں ان میں انسان رہتے تھے ہمارے جیسے لوگ۔''

''نہیں، وہ ہمارے جیسے نہیں ہیں۔ پھر بھی گورنمنٹ نے ان کو اتنے دن یہاں ٹھہرائے رکھا۔ اور اب دوسری جگہ مکان بنا کر دے گی۔''

''بنا کر دے گی؟ اماں ابھی بنائے تو نہیں ہیں۔ پتہ نہیں کہاں لے جا کر پٹخیں گے ان لوگوں کو۔''

اماں اپنی لمبے بالوں کی چوٹی گوندھ رہی تھیں جسے انھوں نے لہرا کر پیچھے اس طرح کیا جیسے اس خیال کو بھی ڈھکیل رہی ہیں۔ ''کون سے پکے گھر تھے؟''

''لیکن اماں وہ کتنے عرصے سے بسے ہوئے تھے یہاں۔'' میں تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ہاں ہاں ان کا کیا ہے وہ پھر کہیں گھر بنالیں گے ایسے ہی۔''

مجھے اماں کا لہجہ آج سے پہلے اتنا سخت اور تکلیف دہ کبھی نہیں لگا تھا۔

''چلو بس کرو! اب بحث بند کرو کھانا کب سے ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

لیکن میرا دل تو پانی پینے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ حالانکہ میرے حلق میں کانٹے سے پڑے ہوئے تھے میں تھوڑی دیر تک گھر کی بالکونی میں کھڑی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ اماں اپنے کمرے میں جائیں اور میں ان کی آنکھ بچا کر باہر کا رخ کروں۔ باہر جہاں موسیٰ جانے سے پہلے مجھ سے ضرور ملنا چاہے گا اس سوچ کے ساتھ ہی میں باہر کی طرف بھاگی۔

اماں نے میرے باہر جاتے قدموں کی آواز کو سن لیا تھا۔ وہ میری طرف لپکیں یہ کہتے ہوئے، اب باہر مت جانا۔

لیکن میرے قدم ان کی آواز نہیں سن سکے۔

باہر ایک ایسی خاموشی تھی جو اکثر شام کے بعد رات سے پہلے جب آسمان پر ابابیلیں اپنا راج کرتی ہیں، محسوس ہوتی ہے۔ دھول ابھی بھی اڑ رہی تھی۔ افراتفری میں تھکن نمایاں تھی۔ اب سب کو پتہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ لوگ اپنا سامان لاد کر ان نامعلوم سمتوں کی طرف جا رہے تھے جہاں ان کو لے جایا جا رہا تھا۔ بہت سی سوزوکیوں اور گدھا گاڑیوں کی آوازیں، میدان کے اس سرے سے آ رہی تھیں جہاں جھونپڑیاں اُکھڑی پڑی تھیں۔ میں آگے بڑھی اور آگے شاید موسیٰ اور اس کے گھر والے کسی گاڑی میں بیٹھے، جاتے نظر آ جائیں۔ اب سڑک آ چکی تھی جس پر سے وہ گاڑیاں جا رہی تھیں سہ پہر ختم ہو رہی تھی، میں ہر گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میرا دل آنے والی شام کی طرح گھگیا سا ہو رہا تھا۔ میں کڑھ بھی رہی تھی موسیٰ جو روز میرا انتظار کرتا تھا، آج مجھ سے ملے بغیر چلا جائے گا۔ اور اس کا وہ خزانہ اب کون کھودے گا وہ زمین، میں کڑھ رہی تھی۔ اور میرے حلق سے میرے سینے تک کڑوا گاڑھا سا مائع جم رہا

تھا۔ جو مجھے درد کی اجنبی فضا میں لے جا رہا تھا۔

اچانک میں نے دیکھا بہت سی تیز رفتار سوزوکیوں اور گدھا گاڑیوں کے بیچ موسیٰ اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، اس کی ماں سب سے آگے سر نہوڑائے ہوئے بیٹھی تھی۔ خود موسیٰ سڑک پر مڑتی ہوئی گاڑی میں مجھے سب سے آخر میں نظر آیا۔ میں نے اپنی تمام طاقت لگا کر آواز لگائی، موسیٰ جو زمین تکتا ہوا جا رہا تھا۔ شاید گاڑی کے پہیوں کی آوازوں نے میری آواز اس تک نہیں پہنچائی۔ میں گاڑی کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔ موسیٰ نے مجھے سر اٹھا کر دیکھا، پھر اس کی آنکھیں بیچ میں ہی ٹک گئیں وہ مجھے بھاگتے ہوئے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ زمین دیکھ رہا تھا جو میرے اور اس کے درمیان فاصلے بنا رہی تھی، میں چلاّ رہی تھی: ''موسیٰ تم جا رہے ہو، تم مجھ سے ملنے آیا کرو گے، موسیٰ تم کہاں جا رہے ہو؟''

میرے تمام سوالات جو یکے بعد دیگرے میرے حلق سے چیخوں کی شکل میں میرے منہ میں سے اٹھتے ہوئے جھاگ کے ساتھ باہر نکل رہے تھے۔ میں بھاگ رہی تھی۔ موسیٰ کی تیز رفتار گاڑی مجھے تیزی سے پیچھے چھوڑ رہی تھی۔ میں بھاگ رہی تھی۔ موسیٰ کی گاڑی کے پیچھے، جو میرے بھاگتے ہوئے قدموں سے آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔ اور شام کے جھٹپٹے میں اتر گئی۔

یہ سب کچھ نیا تھا، وہ درد بھی جو میرے حلق کو پکڑ رہا تھا۔ اور وہ حالت جس سے میں گزر رہی تھی۔ پہلی بار میں اندھیرا خوف بن گیا تھا۔ میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا میں میدان کے بیچوں بیچ اکیلی کھڑی تھی۔ ایک ایسی اداسی میں گھری جو میرے لیے بالکل نئی تھی، جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ پہلی ہی بار مجھے سناٹے کا احساس اپنے چاروں طرف محسوس ہوا۔ میں دیر تک وہاں بیٹھی رہی میرا دل جس آواز میں بین کر رہا تھا وہ صرف مجھے سنائی دے رہی تھی۔

گھر پہنچ کر میں اماں کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکتا تھا دروازہ تو

اماں نے ہی کھولا تھا۔ ان کی آنکھوں میں غصہ تھا اور ان کے ہونٹ کچھ بولنا چاہتے تھے لیکن اماں کی آنکھیں میرا چہرہ دیکھتے ہی تبدیل ہو چکی تھیں۔ اب وہ مجھے ایسے دیکھ رہی تھیں، جیسے میں جب بیمار ہوتی تھی تب ان کی یہ کیفیت ہوتی تھی اماں مجھ سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔ میرے آگے کھانا رکھ رہی تھیں، نوالہ بنا کر میرے منھ میں ڈال رہی تھیں اور میں جو وہ کہہ رہی تھیں اور کر رہی تھیں اس سے یک سر غافل تھی۔ میرے دل میں ایک دکھ سر اٹھا رہا تھا۔ یا یوں کہ غم کا ایک ایسا پودا پھوٹ چکا تھا جس کی کونپلیں میرے جسم میں پھیلنے کے لیے تیار ہو رہی تھیں جن سے میں ابھی بے خبر تھی۔

اماں کھانا کھلا کر کمرے میں بستر پر مجھے لٹا کر دبے قدموں باہر جا چکی تھیں۔ میں پہلی بار تنہائی کے آسیب سے مل رہی تھی اس میں کون میرا ساتھ دیتا۔ کس سے میں کہتی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں بالکونی کی طرف چلی گئی اور رات گئے تک اس میدان کی طرف دیکھتی رہی جہاں اب ننھے جگنو ٹمٹماتے نظر نہیں آ رہے تھے۔

رات گئے میں یہ سوچ سوچ کر مضمحل ہو رہی تھی کہ موسیٰ مجھ سے مل کر کیوں نہیں گیا۔ اس کو یہاں سے لے جانے کی ذمہ داری میں تو نہیں تھی۔ وہ مجھے یہ بھی بتا کر نہیں گیا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ میں یہ سوچ کر تڑپ رہی تھی اور اس اجنبی دکھ سے الجھ رہی تھی جو میرے دل کو آنسوؤں میں بہائے لیے جا رہا تھا۔ وہ رات ایسے ہی گزری جیسے اماں رات میں موم بتی جلا دیتی تھیں جب کبھی لائٹ چلی جاتی تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ سسک سسک کر جل رہی ہو۔

یہ نئے دن کی صبح تھی ایک ایسا دن جس کی شروعات آنکھ کھلتے ہی میرے سینے میں بھرے ہوئے دکھ کی پہلی سسکی سے ہوئی تھی۔ اماں مجھے جگانے آئیں تھیں۔ اماں کے چہرے پر میرے چہرے کا عکس تھا وہ میری آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ میں نے اماں کو بے بسی سے دیکھا اور میرے آنسو بہنے لگے جن کو میں اماں سے چھپانا چاہتی تھی میں تیزی

سے غسل خانے کی طرف چلی گئی جہاں میں نے اپنے آنسوؤں کو پانی سے دیر تک دھویا۔

جیسے کوئی بھیانک خواب کو یاد رکھنا نہیں چاہتا میں بھی اس میدان کی طرف دیکھنا نہیں چاہتی تھی جہاں موسیٰ اب نہیں تھا۔ میری اسکول بس ادھر سے گزر رہی تھی جہاں سے روز گزرتی تھی وہاں سناٹا اور ہو کا عالم تھا کچھ آوازیں تھیں، ایسی آوازیں جو ان ہواؤں کے ساتھ چلتی ہیں جو سب کچھ اڑا کر لے جاتی ہیں جو دلوں کو غموں سے بھر دیتی ہیں۔ اور میرا دل جس غم سے آشنا ہو رہا تھا اسے میں اب تک کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں تھیں جب تک وہ میدان ختم نہیں ہو گیا تھا۔ جانے کب اسکول آیا۔ ایک نئے غم کی دھند میں، میں اسکول میں داخل ہوئی۔ میرا سارا دن اسی دھند میں گزرا۔ سارا دن کسی بھی کلاس میں کسی بھی ٹیچر کا کوئی لفظ میرے کانوں سے نہیں ٹکرایا، میرے کانوں میں بس ان ہواؤں کی آوازیں تھیں جو اس میدان میں چل رہی تھیں، جہاں موسیٰ اب نہیں تھا۔

ایک بار پھر میری بس وہاں سے گزر رہی تھی اسکول سے واپسی پر جہاں اب کچھ نہیں تھا بگولے بناتی ہوا اور وہ سناٹا جسے میں پہلی بار دیکھ رہی تھی، جو میرے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا اور نامعلوم فضا میرے اردگرد ایک ایسا منظر بنا رہی تھی جو بہت اندھیرے میں ٹٹولنے جیسی ہو۔ میں پھر رو پڑی تھی۔ میرے برابر میں بیٹھی لڑکیاں مجھ سے میرے رونے کا سبب پوچھ رہی تھیں، میں انھیں کیا بتاتی۔ کیا یہ کہ موسیٰ مجھ سے ملے بغیر چلا گیا یا یہ کہ موسیٰ نے یہ بھی نہیں بتایا کہ کہاں جا رہا ہے۔

اماں آج میری خوب آؤ بھگت کر رہی تھیں ہمیشہ سے زیادہ، ابا مجھے ایسے بہلا رہے تھے جیسے جب بہلاتے تھے جب میں بیمار ہوتی تھی۔ وہ مجھے کہیں گھمانے لے جانا چاہتے تھے۔ لیکن میں بالکونی سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتی تھی اس بالکونی سے جہاں سے مجھے وہ ٹمٹماتے ہوئے جگنو نظر آتے تھے، جب شام ہونے لگتی تھی اور میں بلا وجہ میں اس بالکونی سے اس علاقے کی جانب دیکھتی رہتی تھی، جہاں موسیٰ رہتا تھا۔

ابا کے بہت اصرار پر میں گھر سے نکل پڑی لیکن میں ابا کے راستے پر نہیں چلی ان کا ہاتھ پکڑ کر اس جگہ لے گئی جہاں موسیٰ زمین کھود رہا تھا۔ میں نے اس گڑھے کی طرف اشارہ کیا، ''ابا یہ وہ گڑھا ہے جو موسیٰ خزانہ نکالنے کے لیے کھود رہا تھا۔''

ابا حیرت سے مجھے دیکھنے لگے گویا ان کو میرے حواسوں پر شک سا ہوا ہو۔ ''یہ تو وہ زندگی بھر نہیں کھود سکتا تھا۔ پاگل تھا کیا؟ باتیں تو تم اچھی اچھی سناتی تھیں اس کی، لیکن یہ کام تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ یہ کہانیوں میں ہو سکتا ہے خواب دیکھا جا سکتا ہے، لیکن حقیقت میں ناممکن تھا۔ اچھا ہوا وہ یہاں سے چلا گیا۔ وہ ذہنی بیمار تھا۔''

ابا نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے اور میں اس زمین پر اس جگہ، ابا کی باتوں سے بے پرواہ اپنی چھوٹی انگلی سے وہ زمین کھود رہی تھی جو موسیٰ نامکمل چھوڑ گیا تھا۔ ابا نے باتیں ختم کر کے میری طرف دیکھا۔ پھر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے اٹھنے کے لیے کہا، ''چلو بیٹا کہیں اور چلیں۔''

مجھے معلوم تھا ابا میری اس حالت سے آگاہ ہو رہے تھے جو اب مجھ پر طاری ہونے جا رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر ابا کو دیکھا ان کی آنکھیں مجھے بھیگی لگیں۔ میں جلدی سے اپنے کپڑے جھاڑ کر کھڑی ہو گئی اور ابا کے آگے آگے چلتی ہوئی گھر کی سمت بڑھنے لگی۔ شام تو ہو ہی چکی تھی۔

میں یہ بھی دیکھ رہی تھی جوں جوں وقت گزر رہا تھا، وہ دکھ جو موسیٰ کے جانے کے بعد مجھے ملا تھا آہستہ آہستہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اور میرے چہرے پر اس کی تپش اپنی شدت دکھا رہی تھی۔ اور جو میرے ماں باپ کے دلوں پر بھی منعکس ہو رہی تھی۔

تیسرا باب

(۱)

میں زندگی کے سفر میں آگے بڑھتے ہوئے اور سنِ بلوغت کو چھوتے ہوئے موسیٰ کی جدائی کے المیے سے لپٹی رہی۔ موسیٰ زمین کھودتے ہوئے اور خزانہ نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی چھوٹی انگلی گنوا بیٹھتا۔ اور جب میں نے اپنی چھوٹی انگلی سے وہ خزانہ کھودنا چاہا تو مجھے بہت ہنسی آئی۔

میں اکثر بہت دوپہروں میں اس جگہ چلی جاتی تھی مجھے یہ یقین تھا کہ موسیٰ آئے گا، لیکن جب تک وہ نہیں آتا مجھے اس کا کام کرنا چاہیے۔ اس کے وہ خواب جو وہ اپنے لوگوں کے لیے دیکھ رہا تھا آخر ایک دن پورے ہونے ہیں۔ میں دیر تک اس جگہ کو کھودتی رہتی۔ بہت دیر تک ان یادوں کے درمیان جو میں نے اور موسیٰ نے باتیں کرتے ہوئے گزاری تھیں۔ میرا یہ روز کا معمول بن چکا تھا اپنی پڑھائی کے بعد میں اس کونے میں خود کو سمیٹ لیتی تھی۔ وقت گزرتا چلا گیا لیکن موسیٰ کی کھودی ہوئی زمین جہاں کی تہاں رہی وہاں گڑھے کی گہرائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میری چھوٹی انگلی اس زمین کو کھودتے کھودتے آگے سے سیاہ اور نیلی ہو چکی تھی۔

اماں اور ابا اب میرے اس کام میں کوئی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ ان کی تمام کوششوں کے باوجود میری حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میرے پاس وقت گزارنے کے لیے ایک اہم کام تھا۔ اپنی پڑھائی کے بعد اس گڑھے کے اردگرد رہنا۔ خزانہ نکالنے کی مہم میں اب میں جُتی ہوئی تھی۔ ان تمام ارادوں کے ساتھ جو موسیٰ کے دماغ میں تھے۔

یہ کہانی لکھتے ہوئے میں سوچ رہی ہوں موسیٰ مجھے کہاں کہاں ملا۔ وہ مجھے کئی بار ملا تھا۔ کئی موڑوں پر میری اس سے مڈبھیڑ ہوئی تھی لیکن اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اس کو آواز دیتی رہی لیکن وہ چشم پوشی کر کے نکل گیا۔ موسیٰ کی نہ پہچاننے کی ادا

مجھے پسند نہیں آئی۔ وہ مغرور ہو رہا تھا اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ پہلی بار مجھے وہ اس بھیڑ میں نظر آیا تھا جب ایک جگہ بہت سے لوگ ہنگامہ آرائی کر رہے تھے وہ اپنی مانگیں پوری کروانے کے لیے حکومت کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے اس جلسہ گاہ کے باہر سے گزرتے ہوئے میں نے موسیٰ کو دیکھا تھا وہ اس مجمع میں گم سم کھڑا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کو غور سے دیکھنے لگی۔ یہ موسیٰ ہو سکتا ہے۔ مجھے زیادہ دیر نہیں لگی موسیٰ کو پہچاننے میں۔ ''تم موسیٰ ہو'' میں نے بھیڑ میں دھکے کھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں کسی اور سے مخاطب ہوں۔ ''ہاں ہاں، تم موسیٰ ہی ہو۔'' وہ تھوڑی دیر مجھے گھور کر دیکھتا رہا پھر اس بھیڑ میں جو پہلے ہی ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھی ٹکراتا ہوا مڑا اور غائب ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے دوڑی لیکن مجھے آگے بڑھنے کا راستہ نہیں ملا۔ میرا دل بھربھری مٹی کے ڈلے کی طرح جو کسی کے پاؤں میں آکر پس جاتا ہے، پس رہا تھا۔ یہ موسیٰ تھا۔ میں نے موسیٰ کو پہچان لیا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں، پتلی نوکیلی ناک اور گھونگھریالے بال، ہاں بالکل موسی ہی تھا۔ موسیٰ اگر مجھ سے مخاطب ہوتا تو میں اس کو یاد دلاتی کہ میں کون ہوں۔ لیکن وہ تو مجھے بالکل ہی بھول گیا تھا اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ میں بھیڑ کے دھکوں سے نکل کر اب گھر کی طرف جا رہی تھی۔

ایک دن پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ خالی سڑک پر چلتے ہوئے۔ ان قدموں کی چاپ نے مجھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا تھا میرا دل حلق میں آ گیا تھا۔ موسیٰ سر پر ایک بھاری گٹھر رکھے اپنے بھاری بوجھ میں دبا ہوا۔ آہستہ آہستہ وہ میرے پیچھے سے آگے نکل رہا تھا۔ میں رک گئی۔ اس بار بھی میں نے پہچان لیا تھا۔

''تم موسیٰ ہو!''

میں نے بے چین آواز میں اپنے قریب سے گزرنے والے سے پوچھا۔ بھاری بوجھ تلے دبے چہرے نے مجھے کن انکھیوں دیکھا، وہ بوجھ کے مارے سر گھما نہیں پا رہا

تھا لیکن اس نے میری طرف دیکھنا نہیں چھوڑا۔ پھر وہ رک گیا۔

''تم موسیٰ ہو نہ؟''

میرا دل اب ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ وہ مجھے پہچان رہا تھا۔ ''تمہیں یاد ہے وہ بستی، وہ میدان اور میں؟'' یہ میں نے اتنی زور سے کہا جیسے وہ بہرا ہو۔ اس نے یہ سنتے ہی اپنا سر نہیں میں ہلانا چاہا لیکن اس کے سر کے بوجھ نے اس کا سر ہلنے نہیں دیا۔ وہ آگے کی طرف بڑھ گیا۔

''تم ہی ہو موسیٰ۔''

میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی وہ آگے آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن خالی سڑک پر مجھے لگا جیسے میری آواز مجھ سے ہی کچھ پوچھنے لگی ہے۔ جس سے میں پوچھ رہی تھی، وہ بہت آگے نکل چکا تھا۔

میں نے سوچ لیا تھا موسیٰ اب ملے گا تو میں اس کو نہیں دیکھوں گی اور نہ اسے آواز دوں گی۔ اپنے آپ کو سمجھنے کیا لگا ہے جس دن اس نے مجھے پہچان لیا میں بھی بتاؤں گی کہ نہ پہچان کر کیا دکھ ہوتا ہے۔ وہ کتنی بار مجھے ملا، میرے قدم سے قدم ملا کر چلا۔ ہم کئی کئی قدم ایک ساتھ چلتے رہے لیکن پیچھے سے کوئی ریلا ایسا آتا جو ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیتا اور اتنی مہلت نہیں ملتی کہ میں اسے کچھ یاد دلا سکوں۔

اب میں نے اس دھوپ میں چلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دھوپ جو میرے جسم کو جلا رہی تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی کی طرف آتے ہوئے موسیٰ کی یاد اب ایک تناور درخت بن چکی تھی جس نے میرے دل میں اپنی جڑیں پھیلا دیں تھیں۔ اس کی یاد نے میرے دل کو میری ہی بربادی کے راستے پر ڈالا تھا۔ میرے ماں باپ آہستہ آہستہ میرے غم میں گھلتے جا رہے تھے۔ اور اپنی تمام وہ خوشیاں جو انھوں نے مجھ سے وابستہ کیں تھیں ان سے بھی دستبردار ہوتے جا رہے تھے۔ انھوں نے میرے اس غم کو ایک ایسی بیماری کی طرح میرے اندر پھیلتے ہوئے دیکھا تھا جو ناقابلِ علاج تھی۔ میں نے اپنی تعلیم ان کی

خواہش کے مطابق ہی پوری کی تھی لیکن اس سارے وقت میں میری زندگی کا ایک ایک دن اپنی مصروفیت کے ساتھ ساتھ کسی ایسے پنچھی کی طرح تھا جو اپنی ڈار سے نکل کر دور بہت دور اڑتا جارہا ہو اتنی دور کہ پلٹنے تو واپسی کا راستہ بھی بھول جائے۔ میری ماں نے میرے لیے جو خواب دیکھے تھے اب ان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اس کی اس تمام کوششوں کو میں نے ضائع ہوتے دیکھا تھا جو اس نے اپنی محبت اور اس کی ملائمیت سے مجھ پر صرف کیں تھیں۔ میرے باپ کے مضمحل ہوتے قوی میری زندگی کی بے اطمینانی سے اور بھی جلدی کمزور ہورہے تھے۔ لیکن میں بھی اپنی تمام تر مصروفیت میں خود کو پیوست کرنے کے باوجود، اس بھول سے کبھی دوستی نہیں کر سکی جو مجھے میرے ان لمحوں کو بھلانے میں مدد دیتی جو موسیٰ کے خیال سے جڑے تھے۔

(۲)

موسیٰ کا خیال اب اس کی باتوں کے ساتھ جڑا ہوا تھا وہ باتیں جو اس میدان میں میرے ساتھ چلتے پھرتے ہوئے کرتا تھا اور وہ زمین کھودتے ہوئے جہاں سے خزانہ نکالنا چاہتا تھا اگرچہ کہ اس کی شکل میں بھلائے دے رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے وہ تیور مجھے ہمیشہ یاد رہے وہ تیور جو کوئی کہانی سناتے ہوئے اس کے چہرے پر پھیل جاتے تھے۔ اور اس کے وہ لفظ جو کسی کہانی کو سناتے ہوئے مجھے اچنبے میں ڈالتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اس طرح شروع کرتا تھا۔

''یہ کہانی تم جیسے لوگوں کی نہیں ہے۔ یہ کہانی ہماری ہے اس لیے کہ تم لوگ نرم بستروں پر سوتے ہو۔ یہ ان کے لیے ہے یعنی ہمارے لیے۔ ہمارے سروں کے نیچے تکیے نہیں ہوتے ہم اپنی اپنی قمیضیں اتار کر اکثر اپنے سر اونچے کرتے ہیں۔''

وہ کہتا ''یہ کہانی تمھارے لیے نہیں ہے یہ کہانی ہماری ہے۔ ہمیں روٹیاں گن کر ملتی ہیں ہم کبھی پیٹ بھر روٹی نہیں کھاتے۔ ہمیں حساب سے کھانا ملتا ہے اور تم لوگ ہمارے

دروازوں کے آگے اپنا بچا ہوا کھانا پھینک دیتے ہو۔''

موسیٰ کے تیوروں میں جو خودسری اور بغاوت کی بو آتی تھی۔ وہ اس کے حالات نے اس میں پیدا کی تھی اور بغاوت جو اپنی زندگی پر قناعت نہ کرنے پر آمادہ رکھتی تھی جو اس کی جیسی زندگی گزارنے والوں میں ہوتی ہے۔

مجھے موسیٰ کی یہ خودسری اچھی لگتی تھی۔ میں نے اب جان لیا تھا کہ موسیٰ سے میری دوستی کیوں ہوئی تھی اور موسیٰ کی باتیں مجھے کیوں اچھی لگتیں تھیں۔ موسیٰ جس کے تیور سرکش گھوڑے کی طرح بگڑے رہتے تھے۔ لیکن اس دن کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا جب اس کے علاقے کے گھروں پر بلڈوزر پھیرا جا رہا تھا اور نہ وہ خود کو وہاں روک سکا تھا۔ جب اس کو وہاں سے لے جایا جا رہا تھا۔ موسیٰ کا بات بات پر تلملانا مجھے اب سمجھ میں آ رہا تھا اور اس کی وجہ لحظہ لحظہ مجھ پر کھل رہی تھی۔

موسیٰ سے میری ملاقات کئی بار ہوئی تھی۔ وہ کبھی کسی جلسہ گاہ میں جہاں بھوک اور نفرت کے خلاف نعرے لگائے جا رہے تھے۔ اور لوگ ایک دوسرے کو ظلم اور ناانصافی کے خلاف اکسا رہے تھے۔ میں نے موسیٰ کو دیکھا تھا وہ گہرے دھویں میں لپٹا ہوا چیخ رہا تھا اس کے منھ سے جھاگ نکل رہے تھا ایک مخصوص آواز اس کے حلق سے نکل رہی تھی۔ جس کے پیچھے بہت سی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ میں اس بھیڑ کو چیرتی ہوئی اس کے قریب پہنچی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھے دیکھے ایک بڑے ٹرک نے اسے اُچک لیا تھا اور موسیٰ دھویں کے مرغولے بناتے ہوئے ٹرک پر بیٹھ کر چلا گیا تھا۔ اور میرے پاؤں سست پڑ رہے تھے میرے آنسو بہہ رہے تھے، اور میں سوچ رہی تھی میں کب تک موسیٰ کے پیچھے دوڑتی رہوں گی، وہ موسیٰ جو مجھے پہچانتا نہیں تھا وہ موسیٰ جس نے جانے مجھے یاد رکھا تھا کہ نہیں۔

(۳)

آہستہ آہستہ میرے ذہن میں موسیٰ کی ایک ایک ادا کا مفہوم کھل رہا تھا۔ زمانہ

آہستہ آہستہ ہی گزر رہا تھا۔ ایک بار لیمپ کی روشنی میں پڑھتے ہوئے میرا ہاتھ جل گیا تھا۔ میں صبح موسیٰ سے ملی۔ میں نے اس کو اپنا جلا ہوا ہاتھ دکھایا۔

''دیکھو موسیٰ میرا ہاتھ جل گیا، کل میں نے بہت پڑھا تھا۔''

میں نے اس پر رعب جمانے کی کوشش کی، تو بہت ہنسا دیر تک ہنستا رہا۔ میں جھنجھلائی ہوئی اس کو ہنستے ہوئے دیکھ رہی تھی، میرا دل جل رہا تھا۔ میرے رعب کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا، میرے جلے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر یہ کیوں ہنس رہا ہے۔ میں روہانسی ہونے لگی۔

''کیوں ہنس رہے ہو؟''

''بس سوچ رہا ہوں تم پڑھ لکھ کر کیا کروگی، آخر تو تم کو چولھا جھونکنا ہے۔''

''تو!''

''تو تمھاری ماں چولھا جھونک ہی رہی ہے۔ وہ پڑھی لکھی نہیں ہے۔ تم جھونکوگی۔ تم پڑھ لکھ کر بھی جھونکوگی۔''

کیا بکواس ہے۔ مجھے غصہ آنے لگا تھا۔

''ہاں ہاں سچ، عورتوں کو اور کرنا کیا ہوتا ہے یہی ان کی تقدیر ہے۔'' یہ سب کچھ وہ اب انتہائی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''تم بکتے ہو۔'' میرا دل جل رہا تھا۔

''ہاں عورت کا مقدر یہی بنایا گیا ہے کہ وہ جتنا چولھا پھونکے اتنا ہی اچھا ہے۔ اچھے اچھے کھانے پکا پکا کر سب کو خوش کرے۔ یہی اس کا معیار ہے جو عورت اچھے کھانے پکا پکا کر کھلاتی ہے وہی اپنے گھر والوں کے دل جیتتی ہے۔''

میں اس کی اس بکواس سے قطعاً متفق نہیں تھی۔ گھر آ کر میں نے اماں سے پوچھا، جو اس وقت باورچی خانے میں ہی تھیں۔ انھوں نے مجھے ایسے پلٹ کر دیکھا جیسے موسیٰ مجھے ان کے خلاف اکسا رہا ہے۔ ہاں، ہاں اماں نے ایسے کہا جس میں ان کا سر

زیادہ ہلا، یہ ٹھیک ہے یہی ہمارا راج پاٹ ہے۔ یہی ہماری خوشی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ یعنی عورتیں، موسیٰ نے جس انداز میں کہا تھا وہ تو یوں تھا جیسے یہ سب عورت کو جبراً کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اماں اسے بڑے اطمینان سے زندگی کی خوشی سے جوڑ رہی تھیں۔

(۴)

میری آنکھیں اس وقت دیر تک لبریز رہیں۔ اس دن بھی میں نے اسے تیز روشنیوں میں ڈھونڈھ نکالا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں وہ ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ تصویروں کی ایک نمائش تھی آرٹسٹوں نے مفلوک الحال مزدوروں اور افلاس سے مارے لوگوں کے چہرے مختلف زاویوں سے بنائے تھے۔ میں ایک ایک چہرے پر ان تاثرات کو ڈھونڈھ رہی تھی جو آرٹسٹوں نے اپنی تصویروں کے عنوانات سے بتائے تھے۔ اچانک میری نگاہ اس کونے پر پڑی جہاں وہ کھڑا تھا۔ مجھے لگا ان تصویروں میں سے وہ ایک چہرہ ہے، میں ٹھٹک گئی۔ وہی تیور، جو میری یاد میں مجھے جال کی طرح الجھائے ہوئے تھے۔ میں تیز چلتی ہوئی وہاں پہنچنا چاہتی تھی۔ ایک فوٹوگرافر مجھے آگے بڑھنے سے روکتے ہوئے میری تصویر اتارتا ہے۔ میں کیمرے کی روشنی میں آنکھیں جھپکا کر اس کونے کی طرف دیکھتی ہوں جہاں اس سے پہلے میرے پاؤں رواں تھے، لیکن وہ کونہ خالی ہوتا ہے میں چندرا کر سارے ہال میں گھومتی ہوں، اس چہرے کو دوبارہ تلاش کرنے کے لیے، سارے ہال میں لوگوں سے الجھتی ہوئی۔ ادھر ادھر بھٹکتی ہوں لیکن بے سود ہے۔ اچانک میری نظر سامنے ایک دیوار پر ایک تصویر کے چہرہ پر پڑتی ہے۔ میں گم سم ہو جاتی ہوں۔ کچھ دھندلے نقوش میرے ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں۔ بے ساختہ، یادوں کا ریلا مجھے پیچھے لے جاتا ہے، کون ہے یہ؟ میں پہلے اپنے آپ سے سوال کرتی ہوں، کس کا چہرہ ہے، پیچھے بھاگتے ہوئے خیالوں کے ساتھ رلتی ہوئی میں بہت پیچھے چلی جاتی ہوں۔ جہاں موسیٰ کے نقوش مجھے ایسے نظر آ رہے ہیں جیسے کوئی رتوندی میں کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایک دھواں

میرے سامنے آ جاتا ہے۔ میں آرٹسٹ کو ڈھونڈتی ہوں اور پوچھتی ہوں۔ کس کی تصویر ہے کون ہے یہ۔ میں اس پورٹریٹ اور میرے درمیان جو دھواں آ گیا تھا اس میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ ایک راہ گیر کی تصویر ہے۔ میں سڑک پر بیٹھا کسی پورٹریٹ کی تلاش میں تھا کہ اچانک یہ مجھے نظر آیا۔ میں سوال کر رہی ہوں، کوئی نام۔ نہیں۔ ہمیں نام سے کیا غرض۔ اس تصویر کی قیمت۔ میں بے تاب ہو کر پوچھ رہی ہوں۔ یہ بک چکی ہے۔ میں بیٹھے ہوئے دل سے باہر نکل آتی ہوں۔

(۵)

موسیٰ اور میرے درمیان یہ آنکھ مچولی، موسیٰ کے دھیان کو اور تر و تازہ رکھے ہوئے تھی۔ درمیان میں کوئی ایسی کڑی نہیں تھی جو وقت سے نکل جاتی اور موسیٰ کی یاد مجھ سے دور ہو جاتی۔ وہ اپنی یاد میں میرے چاروں طرف منڈلاتا رہتا تھا۔ میں کبھی کبھی سوچتی موسیٰ کیسا ہو گیا ہوگا، وہ کیسا نظر آتا ہوگا لیکن وہ ہیولا جو موسیٰ کے نقش کے ساتھ پہلے دن سے میرے ذہن میں بن گیا تھا وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ بگڑے ہوئے سرکش تیوروں کے بیچ، اس کی چلتی ہوئی نوکیلی ناک، بڑی بڑی، اجلی آنکھیں، اور تمسخر اڑاتے ایک طرف کو مڑے ہوئے اس کے ہونٹ۔

میں کبھی کبھی یہ بھی سوچتی تھی کہ موسیٰ اگر ایسے اسکول میں پڑھتا جیسا کہ میرا اسکول تھا تو آج وہ بڑا آدمی بنتا۔ اس کی تصویریں ہو سکتا ہے اخباروں میں چھپتیں۔ اور کچھ نہیں تو وہ کامیاب انسان ضرور ہوتا۔ لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا ہوگا، موسیٰ کسی نچلے درجے کی محنت پر جوت دیا گیا ہوگا، اور نہیں واہی تباہی زندگی گزار رہا ہوگا نچلے درجے کے انسانوں کی طرح۔ لیکن یہ سچ نہیں ہے کہ وہ مجھے بھول گیا ہوگا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آج تک زندگی کے کسی بھی دور میں اس کو بھلا نہیں سکی۔ لیکن پھر وہ مجھے پہچان کیوں نہیں رہا ہے۔ وہ بھی مجھے ڈھونڈتا کیوں نہیں ہے۔ جس طرح میں اس کی تلاش میں ہوں۔

اس کہانی کو شروع کرنے سے پہلے بھی میں نے موسیٰ کو کتنی بار اپنی آنکھوں کی گرفت میں لیا، میں اس کی طرف لپکی لیکن ہر بار ناکام رہی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا موسیٰ کی تلاش میری زندگی کی مہم بنتی جا رہی تھی۔

(۲)

اور اب میری انگلیاں خزانے والی زمین کو تیزی سے کھودنے لگیں تھیں، وہ خزانہ جو موسیٰ اپنی چھوٹی انگلی سے کھود رہا تھا۔ روز بھر بھری مٹی کا ایک ڈھیر میرے پاؤں پر جمع ہو جاتا، روز ہوائیں اس میدان میں چلتیں اور دوبارہ پاٹ دیتیں اس گڑھے کو، جو میں موسیٰ کو یاد کرتے ہوئے کھود رہی تھی۔ صبح اور شام کے اترنے اور چڑھنے کے بیچ، وقت کے بہتے ہوئے سمندر میں، میں آگے بڑھ رہی تھی،ایک ہی خیال کے ساتھ، آگے اور آگے یہاں تک کہ میں اپنے آپ سے بچھڑنے لگی تھی۔ میں اپنے نام کو بھولتے ہوئے صرف ایک نام کے تسلسل کے ساتھ، صرف ایک دکھ کے بہاؤ کے ساتھ، جو موسیٰ کی یاد سے لپٹا ہوا تھا۔

ان گنت لمحوں کی بازگشت، جن میں ایک نام کی گونج، اور اس کے بیچ میری زندگی قطرہ قطرہ دن اور رات کے درمیان مجھے بے حال کرتی ہوئی۔

میں ایک قید میں خود داخل ہوئی تھی میں نے اپنے چاروں طرف دیواریں کھڑی کیں تھیں اور ان سے نکلنا اب میرے بس میں نہیں تھا۔ باہر کی دنیا میں بندھی ٹکی زندگی کی چہل پہل اب میرے لیے نہیں تھی۔ جو تھی تو وہ صرف روزمرہ کے معمولات کے ساتھ زندہ رہنا۔ لیکن اس کا خمیازہ میرے ماں باپ اٹھا رہے تھے۔

ان کی ڈھلتی ہوئی عمریں میری حالت کو دیکھ رہی تھیں، وہ سہہ نہیں پا رہے تھے میری اس بپتا کو جو مجھ پر گزر رہی تھی۔ ان کے لیے یہ ایسا ہی تھا جیسے میں کسی مہلک بیماری کا شکار ہوں اور میرا علاج ناممکن ہو چکا ہے۔ وہ کڑھ رہے تھے اور جی رہے تھے۔ میں

ان کی حالت دیکھ رہی تھی لیکن خود میری حالت میرے بس میں نہیں تھی۔ گھر کی خاموشی اور سناٹے میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اماں کے تمام خواب جو انھوں نے میرے لیے دیکھے تھے اب ان کی آنکھوں میں ہی جھول رہے تھے۔

(۷)

وہ تمام فاصلے جو میرے اور موسیٰ کے بیچ پھیل گئے تھے، ان کی کتھا لکھتے ہوئے میں سوچ رہی ہوں کیا موسیٰ یہ کتھا پڑھ پائے گا۔ کبھی اچانک اس کے ہاتھ میری یہ کہانی لگ جائے اور وہ سب یاد کر لے، سب جو وہ پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ ہوسکتا ہے اس طویل مدت میں وہ، وہ سب بھلا بیٹھا ہو مجھے بھی، لیکن وہ گڑھا، وہ کیسے بھول سکتا ہے جس سے اس کے خواب جڑے تھے، جسے کھود کر وہ خزانہ نکالنے کی مہم پر مجھے جٹا گیا تھا۔ میں آج بھی وہ خزانہ کھود رہی ہوں۔ مجھے لگتا تھا میری انگلیاں ایک ایک کر کے ضائع ہو رہی ہیں۔ اور میں جلدی ایک معذور زندگی گزارنے کے راستے پر چل نکلوں گی۔ اب میرے چاروں طرف تنہائی کی پراسراریت پھیل رہی تھی، ایک انجانی بساندھ جو میرے جسم کو کس رہی تھی۔ اور ہر وقت میری ناک کے راستے کچھ اس طرح میرے پیٹ میں داخل ہوتی رہتی جیسے قیمتی اور پسندیدہ کپڑوں کو محفوظ رکھنے کے لیے کوئی ایسی دوا ڈالی جاتی ہے جو ان سے ہمیشہ کے لیے چپک جاتی ہے۔

اس تنہائی کے بیچ میں اب یہ سوچ سوچ کر بھی کڑھتی تھی کہ اس کا ذمہ دار موسیٰ ہے جو اپنا پتہ بتائے بغیر چلا گیا تھا جو پھر مجھ سے ملنے بھی نہیں آیا، جس نے اپنی یاد کی ذمہ داری بھی مجھے سونپ دی۔ جس نے مجھے تنہائی کی دلدل میں لا پھینکا تھا۔ وقت کی بے مہری میرے ساتھ جو چال چل گئی تھی میں اس میں اب اس طرح پھنس گئی تھی کہ خود کو نکالنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک بھنور تھا۔ جس میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی لیکن اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

(۸)

وہ اداسی جو بچپن میں موسیٰ کے کھو جانے سے ملی تھی، اس نے مجھے دوسری لڑکیوں جیسا نہیں چھوڑا تھا۔ دوسری لڑکیوں کو جب میں شور مچاتے ناچتے گاتے دیکھتی۔ انھیں ان خوابوں میں دیکھتی جو ان کو زندگی کی خوبصورت شاہراہوں پر لے جانے والے تھے ایسے سے میں کسی کونے میں ان سے علیحدہ ہو کر موسیٰ کے خیال کے پیچھے بھاگنے لگتی ایسے ہی کسی شور میں مجھے موسیٰ کی ٹھہری ٹھہری باتیں یاد آنے لگتیں، جب ایک دن ایسی ہی شور مچاتی سڑک پر ہم دونوں نکل گئے تھے۔ میں نے موسیٰ سے پوچھا تھا یہ سڑک کہاں ختم ہوتی ہے موسیٰ نے کہا تھا مجھے نہیں معلوم، مجھے صرف اتنا معلوم ہے یہ سڑک واپس اسی جھونپڑی میں ختم ہو گی جہاں میری ماں اداس بیٹھی ہو گی اور اس کے ارد گرد میرے بہن بھائی بیٹھے ہوں گے۔ کیوں اداس کیوں؟ میں نے سوال اس طرح کیا تھا جیسے میں اداسی کا مطلب بھی پوچھنا چاہتی ہوں کیونکہ جب مجھے نہیں پتہ تھا اداسی کیسی ہوتی ہے۔ اس وقت اس نے اپنی اجلی آنکھوں سے مجھے جل کر دیکھا تھا۔ بس شام ہوتے ہی مجھے وہ سب اداس نظر آنے لگتے ہیں۔ ٹمٹماتی ہوئی لالٹین کی روشنی کے بیچ ان کے چہرے مجھے تکلیف پہنچاتے ہیں۔

''ان کی آنکھیں جہاں کوئی خواب نہیں ہے''، اس نے سر جھکا کر کہا تھا۔ میری سمجھ میں اس وقت موسیٰ کی یہ بات نہیں آئی تھی۔ پھر بھی میں نے اس سے پوچھ لیا تھا۔

''تم خواب دیکھتے ہو؟''

''ہاں وہ گڑھا جو میں کھود رہا ہوں وہ ایک خواب ہی تو ہے۔''

میری سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا تھا۔

''مگر میں خواب نہیں دیکھتی، مزے سے سوتی ہوں، بس صبح آنکھ کھلتی ہے۔''

اس وقت موسیٰ اپنی آنکھوں میں چنگاریاں بھر کر بولا تھا: ''ہاں، خواب دیکھنے کی

زحمت تم کو کیوں کرنی پڑے گی جب وہ خود طشتری میں تمھارے سامنے لا کر سجا دیے جائیں گے۔''

میں احمقوں کی طرح منھ کھولے اس کی بات سنتی رہی تھی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ وہ ہر وقت کھیلتے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے، درشتی اور بے چینی سے اپنی نگاہیں ایسی گھماتا تھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ یہ باتیں جو مجھے ایک ایک کر کے یاد آتی ہیں اگرچہ کہ میرے لیے ان کا بیان بہت مشکل ہے کیوں کہ اتنے واقعات کی بھیڑ میں سے اس کی باتیں اور اس کی یاد کو الگ کرنا میرے اختیار سے باہر ہے وہ سب آپس میں اس طرح گھل مل گیا ہے جیسے میں کوئی پانی کا قطرہ ہوں جو موسیٰ کی یاد کے سمندر میں گر گیا ہو۔

(۹)

اب میں گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی تھی اور تنہائی کا دائرہ ایک شکنجے کی طرح مجھے دبوچ رہا تھا۔ میں یہ بھی جان گئی تھی کہ موسیٰ کی یاد ایک واہمہ کی شکل اختیار کر چکی ہے جو میری زندگی کو بھی واہمے میں بدل رہی ہے۔

میرے ماں باپ اب ملتجی نگاہوں سے مجھے دیکھتے۔ شاید میں ان کے غموں کو جان کر ہی اس حالت سے باہر نکل جاؤں، لیکن یہ دکھ انتہائی خودغرضی سے مجھے بھی خودغرض بنا رہا تھا۔

اس دن میری پڑھائی ختم ہونے کا آخری دن تھا۔ میں امتحان دے کر گھر آ کر بیٹھی تھی۔ اماں میرے نزدیک بیٹھی ہوئی تھیں۔

''بیٹا تم نے اب کیا سوچا ہے؟، اب تم کیا کرو گی؟''

میں جانتی تھی اماں مجھ سے کیا چاہتی ہیں، اور میں یہ بھی جانتی تھی میرے دکھ کا کوئی انجام نہیں ہے، وہ اب سفر کرتا رہے گا۔ وہ بے چین نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں

اور میں ان کی بے چین نظروں کا جواب اپنی بے چین نظروں سے دے رہی تھی۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ میں اپنے دکھ کو لفظ دے دوں۔ لیکن مجھے معلوم تھا میرے لفظ ماں کے دکھ کو اور بڑھا دیں گے۔ میں خاموشی سے ان کی شکل دیکھ رہی تھی، اماں اب نڈھال ہو رہی تھیں۔ میری خاموشی ان کی بے بسی میں اضافہ کر رہی تھی۔ میں جانتی تھی ماں باپ کی تمام خوشیوں کو میں نے اپنی یاد کی چھلنی میں چھان دیا تھا۔

اماں پوچھ رہی تھیں: ''تمہیں آگے جانے کے لیے کوئی سمت تو اختیار کرنی ہے، اکیلے کب تک رہو گی۔''

اماں اب التجا کر رہی تھیں، اور میرا دل کٹ کٹ کر گر رہا تھا۔

''آپ کیا چاہتی ہیں؟''

میں نے بے اختیار ہو کر ان سے پوچھا۔

''شادی کر لو۔''

میں اماں کے چہرے پر پھیلی ہوئی آس پر پسیج رہی تھی۔ ''کس سے؟''

''بس تم ایک بار ہاں کر دو۔ کب تک یہ زندگی گزارو گی۔ جس راستے پر تم چل رہی ہو۔ اس کا کوئی انت نہیں ہے۔''

اور میں اپنے دل سے پوچھ رہی تھی: کیا ایسا ہی ہے، کیا یہ پراسرار دھند کبھی چھٹے گی جس میں، میں پھنسی ہوئی ہوں۔ اب تو یہ دکھ مجھے اپنا عادی بنا چکا تھا، اس کے بغیر بھی رہنا مشکل تھا۔ میں اماں کو کیسے سمجھاتی۔ اب اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن میں اماں کو کوئی جواب نہیں دے سکی۔ ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی آس نے مجھے صرف خاموشی سے ان کے چہرے کو تکنے پر مجبور کر دیا۔ میری خاموشی نے اماں کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔

میں دیکھ رہی تھی اماں کے چہرے کی پژمردگی آہستہ آہستہ ایک بے چین کر دینے

والی خوشی میں بدل رہی تھی۔

میرے ماں اور باپ اپنے فیصلے پر میرا سر جھکا ہوا دیکھ کر خوش تھے۔ ان کی خوشی ایسی ہی تھی جیسے کوئی مریض آپریشن تھیٹر میں موت اور زندگی سے لڑ رہا ہو اور اس کے زندہ رہنے کے آثار ختم ہو جائیں اور پھر اچانک پتہ چلے کہ مریض بچ گیا۔ یہی حالت میرے ماں باپ کی تھی۔

اور میں صرف سوچ رہی تھی کہ میں کہاں ہوں۔ جس یاد کی دلدل میں گردن تک پھنس گئی ہوں کیا یہ مجھے کوئی اور زندگی گزارنے دے گی، وہ زندگی جو موسیٰ کی یاد سے خالی ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے کہ اب آنے والا وقت ہی مجھے اپنے بہاؤ میں لے کر چلے گا مجھ میں سوچنے کی سکت ختم ہو رہی تھی ایک انہونی مجھے اپنی زد میں لے رہی تھی۔ حالات کے اس شور شرابے میں میرا صرف ایک ہی کام تھا چپکے سے کسی بھی وقت اس سناٹے کی طرف نکل جاتی، جہاں وہ گڑھا میرا منتظر ہوتا اور میں اس گڑھے کو کھودنا شروع کر دیتی۔ اور اپنی انگلیاں دیکھتی جو اب اس گڑھے کی نظر ہو چکی تھیں۔

میری ماں اپنی مصروفیت میں سرشار تھی۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی اماں نے تمام رشتے داروں کو بلا چھوڑا تھا۔ ڈھول رات بھر بجایا جاتا تھا۔ لڑکیاں جھوم جھوم کر دلہن کا بابل کے گھر سے چلے جانے کا گیت گاتی تھیں۔ اس وقت میرا دل ہر بول پر اس رسی پر چلنے لگتا تھا جو دونوں طرف نہ جانے کہاں سے بندھی تھی، اس کے کنارے مجھے نظر نہیں آتے تھے۔ اور نیچے بہت گہری کھائیاں جن میں گرنے کے خوف سے میرا دل تھوڑی دیر کو خاموش ہو جاتا تھا۔ لڑکیاں گاہے بگاہے میرے چاروں طرف آجاتیں اور مجھے اس نام سے چھیڑتیں جو آئندہ زندگی میں میرے نام کے ساتھ جُڑنے جا رہا تھا۔ میری آنکھیں ان کی چھیڑ چھاڑ پر مسکرا دیتیں لیکن میرا آئینہ ان مسکراتی آنکھوں سے آنسو پوچھتا رہتا۔ دن بھر کے شور اور غوغے میں اور رات میں ڈھول کی تھاپ میں، میں صرف اسی کوشش میں رہتی کہ اپنی یادوں کے جال کو کاٹتی

چلی جاؤں اور جال میں الجھے اپنے جسم کو ان سے باہر لا سکوں۔ میری اس حالت سے کوئی واقف نہیں تھا۔ صرف اماں کبھی کبھی میرے پاس سے گزرتے ہوئے ٹھٹک کر کھڑی ہو جاتی تھیں لیکن پھر خود کو ہی تسلی دیتی ہوئی آگے بڑھ جاتی تھیں۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ لوگ گا بجا کر تھکے ہارے سو رہے تھے میرے ماں باپ کے کمرے کی بتی ابھی تک جل رہی تھی میں خاموشی سے دبے قدموں باہر آئی۔ صحن میں کنارے کنارے لگے میری ماں کے لگائے ہوئے موتیا کے پھول ابھی تازہ تازہ کھلے تھے اور خوشبو پھیلا رہے تھے۔ لڑکیاں بیچ صحن کی دری پر ایک دوسرے پر سر رکھے گہری نیند میں ڈوبی ہوئیں تھیں۔ میرے قدم آہستہ آہستہ اس دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے جو باہر جاتا تھا۔ باہر اندھیرا تھا۔ سناٹا تھا۔ اور ہوائیں تیز تھیں میں اس کونے کی طرف جا رہی تھی اس گڑھے کو کھودنے کے لیے، جسے کھودتے کھودتے میری انگلیاں زخمی ہو چکی تھیں میں گڑھے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ گڑھا ابھی تک اتنا ہی کھدا ہوا تھا، جتنا موسیٰ چھوڑ گیا تھا۔ میں دیر تک وہاں بیٹھی رہی، اور اس گڑھے سے آخری بار اپنے تعلق کو جوڑنے کی کوشش کرتی رہی، میرے آنسو بہہ رہے تھے اور اوس میں بھیگی نم مٹی کو اور نم کر رہے تھے۔ میرے چاروں طرف پر اسرار ہوائیں اس طرح میرے جسم کو چھو رہی تھیں گویا مجھے دلاسہ دے رہی ہوں۔ میں دیر تک سر نہیوڑائے بیٹھی رہی، اس خاموشی اور سناٹے کے درمیان، جہاں صرف میں تھی، جہاں موسیٰ بھی نہیں تھا۔

(۱۰)

صبح پھر ایک نیا ہنگامہ تھا۔ بارات کو خوش آمدید کہنے کی تیاریوں میں میرے ماں باپ لگے ہوئے تھے۔ اور میں بھی خود کو دلہن بننے پر آمادہ کر رہی تھی۔ تمام کارروائیاں شادی میں ہونے والے جھمیلوں کی طرح ہی ہو رہی تھیں بارات بھی آئی اسی تام جھام سے جیسے تمام باراتیں آتی ہیں۔ مجھے بھی سجایا گیا تھا جس طرح کسی بھی دلہن کو سجایا جاتا

ہے۔ اسی اہتمام کے ساتھ تمام رسومات ہونا شروع ہوگئیں تھیں جس میں اس بات کا خیال ہر لمحے رکھا جاتا ہے کہ ہر شوق پورا کیا جائے۔ میرے ماں باپ بھی اپنی مرادوں کو عملی جامہ پہنا رہے تھے۔ اس میں شاید آرسی مصحف بھی شامل تھا۔ ایک شور میرے چاروں طرف بھنبھناہٹ کی شکل میں تھا۔ اور میں سکتے کے عالم میں تمام رسموں سے گزر رہی تھی۔

وہاں ایک آئینہ تھا۔ آئینے میں میرا چہرہ دیکھنے والی آنکھیں۔ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے ان گھورتی ہوئی آنکھوں میں اپنی آنکھیں گڑو دیں۔ بھنبھناتا ہوا شور اب بڑھنے لگا تھا جیسے میرے چاروں طرف شہد کی مکھیاں دائرے میں گھوم رہی ہوں۔ شور میں تیزی بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ میدان تھا اور اس کی ہوائیں اس شور میں شامل ہو رہی تھیں۔ میں نے اس چیخ کو روکنے کی کوشش کی جو میرے دل سے اٹھنا چاہتی تھی۔ موسیٰ، تم موسیٰ ہو۔ میرے ہونٹ ہلے تھے وہ آواز سنائی دی گئی تھی۔ وہ آواز خود میں نے سنی تھی۔ اپنی آواز، جو خود میں نے بھی سُنی تھی۔ جو میرے دل کو چیرتی ہوئی باہر آئی تھی۔ چہرہ آئینے سے غائب ہوگیا تھا۔ آرسی مصحف کی رسم ختم ہوگئی تھی۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ یک لخت جامد ہوگئی تھی۔ میری ماں میرے برابر میں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس اندھیرے سے باہر جو آرسی مصحف کے چھتر میں تھا، کچھ بھی نہیں ہوا، سوائے ایک خاموشی کے جو سب کے ہونٹوں پہ چپک گئی تھی۔ لڑکیوں کے قہقہے، بارات میں آئے لوگوں کی مسکراہٹیں سب خاموشی سے چپک کر کھڑی ہوگئی تھیں۔ پھر بھی رخصت کا وقت آگیا تھا۔ اور میرے قدم اس گھر سے دور جا رہے تھے جہاں وہ گڑھا روز میرا منتظر ہوتا تھا کہ میں اسے کھودوں اور اس خزانہ کو نکالنے کی مہم جاری رکھوں جو موسیٰ جاتے ہوئے نامکمل چھوڑ گیا تھا۔

چوتھا باب

(۱)

وہ دوسرا گھر تھا، دوسرا کمرہ، دوسرا بستر، جہاں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کمرہ ملگجے اندھیرے سے گھرا تھا۔ میں نے خود کو اجنبی پایا، یہ میں ہوں۔ میں کہاں ہوں، کیا مجھے یہاں ہونا چاہیے تھا۔

لیکن اس سب کے درمیان یک لخت ایک سناٹا آ گیا تھا۔ جو میرے ہی سوالوں کے جواب میں چھا گیا تھا۔ وہ آگ جو عرصے دراز سے مجھے جھلسا رہی تھی وہ بھی ایک طرف کو سمٹ گئی تھی۔ ہر چیز ساکت تھی۔ یوں جیسے ٹھہرے ہوئے پانی میں گرنے والا کنکر بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ چھت پر تنے ہوئے رنگ برنگی پھولوں سے اٹھتی ہوئی مہک، اور کمرے کی پراسرار خاموشی، جو آرسی مصحف سے پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک آ ئی تھی، میرے چاروں طرف سرسرا رہی تھی۔ میں نے اس اجنبیت کو، جو مجھے اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، نیند کے حوالے کرنے کی کوشش کی لیکن نئی فضا نے مجھ کو بری طرح گھیر لیا تھا کہ نیند کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ جتھے سے اکھڑے ہوئے دل کو میں پہلے سے ہی سنبھالے بیٹھی تھی کہیں اس وقت موسیٰ نہ آ جائے اور میں ایک بار پھر ان فضاؤں میں جا پہنچوں جہاں آج مجھے جانے کی ممانیت تھی۔ خود میں اپنے آپ کو روک رہی تھی کمرے سے باہر بلا کی خاموشی تھی۔ کسی کے قدموں کی چاپ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اچانک کمرے کا پردہ ہلا اور وہ شخص دروازے سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دروازے پر رکا رہا۔

''ہاں پہچان لو میں موسیٰ ہوں۔ میں موسیٰ ہوں نا؟ کیا میں موسیٰ ہوں؟'' وہ بڑبڑا رہا تھا۔ میں آنکھیں بند کیے تھی۔ اس کی آواز نے وہ سارے ارادے منہدم کر دیئے تھے جن کو میں شدت سے سنبھالے بیٹھی تھی۔ اب میں اس کھلے میدان میں دوڑ رہی تھی۔ میرے ساتھ موسیٰ تھا۔ بہت دیر تک میں اس میدان میں چکر لگاتی رہی، میرے دھیان کی

ڈور ٹوٹی تو میرے کانوں میں ایک آواز چیخ کی طرح انڈیلی جا رہی تھی: ''یہاں کوئی موسیٰ نہیں ہے۔ تم جا سکتی ہو۔ ورنہ بتاؤ کون ہے موسیٰ تمھارا؟''

میرے اندر کی پراسرار خاموشی میری آنکھوں میں چنگاریاں پیدا کر رہی تھی، وہ خاموشی جو کسی بھی طلسم کا حصہ ہوتی ہے۔

موسیٰ کون ہے۔ اس سوال کا جواب میں دینا بھی چاہتی تو بھی نہیں دے پاتی۔

موسیٰ کون ہے؟ موسیٰ سے میرا کیا تعلق ہے؟

یہ بتانے کے لیے میں لفظ کہاں سے لاتی۔ وہ لفظ کہاں تھے جو یہ بتاتے کہ موسیٰ سے میرا کیا تعلق ہے۔ میں آج پہلی بار اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہی تھی۔ اور یوں لگ رہا تھا کہ جو سفر میں طے کر کے آئی ہوں اس میں مجھے الٹے پاؤں لوٹنا پڑے گا۔ کیوں اور کیسے میں اس جال میں پھنستی چلی گئی۔ کیا میں کہیں رک نہیں سکتی تھی۔ اس ہیبت ناک اور بدنصیب کر دینے والے دکھ سے ماورا۔ کیا تھا یہ سب کچھ، کیوں ہوا یہ سب میرے ساتھ۔ ایک نام اور ایک خیال کے پیچھے۔ لیکن پھر میں نے ہی خود کو تسلی دی۔ موسیٰ ایک نام تو نہیں تھا نہ ایک خیال، وہ جیتا جاگتا، بہت بولتا ہوا، میرے کانوں میں اس کی آوازوں نے تو ایک جنگل بنا لیا ہے، جو ہر وقت سائیں سائیں کرتی ہواؤں کی طرح چلتی رہتی ہیں اگر وہ مجھ سے دور نہیں جاتا تو میرے ساتھ ہی ہوتا میں اسے دیکھتی بھی چھوتی بھی اس کے ساتھ ان ہی فضاؤں میں رہتی جن میں اس نے مجھے چھوڑا تھا۔ وہ بھی تو جاتا کب چاہتا تھا اور اس کو جس تشدّد کا سامنا کرنا پڑا۔ اور آج بھی وہ جانے کہاں اپنے حصے کی زحمتوں میں گھرا ہوگا، اٹھا رہا ہوگا اپنی بدنصیبیوں کی آگ، اس کی ہتھیلیاں جل رہی ہوں گی۔ یا پھر دوڑ رہا ہوگا کسی میدان میں یا پھر کسی کونے میں بیٹھا کوئی خزانہ اپنی چھوٹی انگلی سے کھود رہا ہوگا ان کے لیے جن کو ہسپتال میسر نہیں ہیں اور جن کو ایک وقت کی روٹی کے لیے گھنٹوں اور دنوں لائنوں میں کھڑا ہونا پڑتا ہے خالی پیٹ۔ یا دھکّے کھا رہا ہوگا ان لوگوں کے ساتھ جن کو چنا گیا ہے مشقت کی بھیڑ میں رہنے کے لیے۔ میں کچھ پوچھ رہا

ہوں۔ آواز کی گونج مجھے خیال کی لمبی سرنگ سے باہر گھسیٹ لائی۔

ایک بار پھر اس رات کی پراسراریت بڑھنے لگی تھی، کمرے کی گلابی روشنی نے یاد کے اس لمبے سفر سے یک لخت باہر آنے کے بعد میری آنکھوں کو اودے سے رنگ میں ڈبو دیا تھا۔ میں نے آنکھیں مل کر اس شخص کی طرف دیکھا۔ وہ شاید دیر سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے مجھے وحشت سے بھری آنکھوں سے دیکھا، میرے اور اس کے درمیان ایک چوکور فریم میں فٹ تصویر سی آ گئی تھی۔ فریم بڑا ہو رہا تھا۔ تصویر بڑی ہو رہی تھی۔ اس نے تصویر کا فریم بڑا ہونے سے روک دیا۔ وہ اپنا ہاتھ بڑھا کر مجھ سے پوچھ رہا تھا، وہی سوال جو میں خود اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی، کون ہے موسیٰ؟

''کون ہے موسیٰ''، میں نے اودی روشنی میں آنکھیں اپنے دل نے ساتھ ساتھ پھیلائیں، اور اس کا سوال دہرایا۔

''کیا میں اس سے مل سکتا ہوں۔''

''تم بھی کیسے ملو گے، جب کے میں ہی نہیں مل سکتی۔''

''کیوں؟''

''اگر وہ مجھے مل جاتا تو میں آج یہاں کیوں ہوتی۔''

''کب چھوڑا اس نے تمہیں؟ کیسی دوستی تھی تمہاری اس سے۔''

''پتہ نہیں۔'' میں نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں پھیلا کر جواب دیا۔

''کب ملا وہ تمہیں، کہاں ملا تھا؟''

کہاں کب، میں پھر بھاگنے کے ارادے کو روکے ہوئے تھی۔ موسیٰ سے خیالوں کے جنگل میں دھند تھی، کہر تھا اور ہمیشہ کی طرح مجھے سزا دینے والی یاد۔

''تم کو بتاؤں گی تو کئی راتیں کئی دن گزر جائیں گے۔''

وہ شاید میری ذہنی ابتری سے واقف ہو رہا تھا۔ ''تو اب کہاں ہے؟''

''تم ڈھونڈھ سکتے ہو تو جاؤ ڈھونڈ کر لاؤ۔ وہ کسی کوئلے کی کان کھود رہا ہوگا اور

بیرے کے کاروباری اس پر نگاہ رکھے ہوں گے۔'' میری آواز اس کو پریشان کر رہی تھی۔

''تمھارے ماں باپ نے ایک پاگل کو میرے حوالے کر دیا۔''

ایسا ہوسکتا ہے کہ میں پاگل ہوں اور میرے ماں باپ اس یقین میں یہ زندگی گزار رہے ہوں کہ دنیا ان کے بہلاوے میں آجائے اور میں اس دنیا کے قابل کہلاؤں۔

''لیکن مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں میں تم کو اس کے حوالے کر سکتا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟''

وہ اپنی ہمدردی اپنی زبان میں لپیٹ کر بولا۔

اس کے سوال میرے دل میں دھوئیں کے مرغولے بنا رہے تھے۔ میں اس کو کیسے بتاؤں موسیٰ کہاں ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ ایک ایسے لفظ کی طرح نظر آیا جس پر نقطہ لگانا کوئی بھول گیا ہو۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ وہ میرا امتحان لے رہا تھا اور خود الجھنوں میں گھس رہا تھا۔

''کیا میرے سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔''

''ہے، اگر تم اسے ڈھونڈنا ہی چاہتے ہو تو تم اس میدان میں جاؤ جہاں وہ مجھے ملا تھا۔''

''کہاں؟''

''جہاں سے میں آئی ہوں۔ اس گھر کے پاس میدان ہے ایک تکونے کونے کے پاس ایک گڑھا ہوگا، جو موسیٰ نے کھودنا شروع کیا تھا۔ لیکن وہ اسے کھود نہیں سکا۔''

''کیوں؟''

''لوگ اسے اٹھا کر لے گئے۔ وہ چھوٹی انگلی سے گڑھا کھود رہا تھا۔'' میں دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں اب وحشت کے ساتھ ساتھ خوف بھی نمایاں ہو رہا تھا۔

''کتنا عرصہ ہوا؟'' وہ سوال کے دوران ہکلا رہا تھا۔

''جب میں نویں کلاس میں تھی۔''

''بچی تھیں یعنی۔''

"ہاں۔" میں نے اس کے چہرے پر ایک ہلکی سے ازتی ہوئی پرسکون پرچھائیں دیکھی۔

"جب سے موسیٰ کو یاد رکھا ہے۔"

"ہاں۔"

"تو تم ایک خیال کے پیچھے دوڑ رہی ہو۔"

"نہیں، میں کئی بار اس سے ملی بھی ہوں۔"

"کہاں؟"

"جہاں جہاں وہ ملتا رہا۔"

"تم پہچان جاتی ہو۔"

"ہاں۔ وہ موسیٰ ہی ہوتا ہے۔"

"تم کو کیسے یقین ہوتا ہے۔ نادان ہو، خیال کی قوت تمھارے حواس پر چھا گئی ہے اور کچھ نہیں۔ شاید ابنارمل حد تک۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے یہ سب ہوش و حواس کا حصہ ہے۔ موسیٰ اور اس کا خیال۔ تم میرے آنسوؤں کو خیال کا حصہ نہیں بنا سکتے۔" میں نے اپنے آنسوؤں کو جو میرے چہرے پر اتنی دیر میں پھیل چکے تھے اپنی انگلی سے اٹھا کر دکھایا۔

"یہ حقیقت ہے لیکن وہ خیال تمھارا وہم ہے۔ جو گزر گیا اسے اب بھولنا ہوگا۔ ویسے بھی انسان بدلتا ہے حالات تو ویسے ہی رہتے ہیں۔ پھر موسیٰ نے تم کو کب یاد رکھا ہو گا۔ اگر یاد رکھتا تو تم سے ملنے ضرور آتا۔"

اس گفتگو کے بیچ وہ میرا ہاتھ تھام چکا تھا۔ اور اس رات کی پُراسرایت کے ساتھ ساتھ اس کی سرگوشیاں میرے کانوں میں گرم ہواؤں کی شکل اختیار کر رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی حرکت، اس کے ہونٹوں کا ٹکراؤ اس پُراسرایت کو اور بڑھا رہے تھے۔ سامنے دیوار پر لگے شیشے میں موسیٰ میرے سامنے تھا۔ وہ اپنی اجلی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں وہی تندی تھی جب وہ غصے میں ہوتا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس شخص نے بھی میری آنکھوں کی سیدھ میں دیکھا۔

''آئینے میں کیا دیکھ رہی ہو؟''

''موسیٰ کو۔ وہ سامنے کھڑا ہے۔ تم ابھی کہہ رہے تھے وہ مجھے بھول گیا ہوگا، ایسا نہیں ہے۔ وہ دیکھو وہ سامنے کھڑا ہے۔''

وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے میرے چہرے کی طرف ایسے دیکھا جیسے میں کوئی وہم ہوں۔

''کیا گھور رہے ہو؟'' میں موسیٰ سے مخاطب تھی۔ ''تم ہمیشہ کی طرح آج بھی مجھ سے خفا ہو۔ میرا اس میں کیا قصور ہے۔''

میں نے اپنا دبیز دوپٹہ جو میرے سر پر منڈھا ہوا تھا دور پھینکا۔ وہ شخص بستر سے اتر کر دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور میری حرکتوں کو دیکھنے لگا۔ میں جب تک آئینے کے قریب جا کر کھڑی ہوں موسیٰ جا چکا تھا۔ اور شیشے میں میرا شکست خوردہ وجود مجھے نظر آ رہا تھا جس کے چہرے پر شکستگی کے مضحکہ خیز آثار تھے۔

اور وہ کمرے سے باہر جا رہا تھا جو مجھے ابھی تک یقین دلا رہا تھا کہ میں سب بھول جاؤں۔ میں ملگجے اندھیرے میں خود کو سمیٹ کر لیٹ گئی وہ رات ایسی گزر رہی تھی جیسے بہت اندھیرے میں سمندر کی آوازیں کہیں دور سے آتی سنائی دیں۔

(۲)

صبح کی سفیدی میں رات بھر تلاش کرتی رہی۔ رات جو گزرنے پر نہیں آ رہی تھی۔ میری موندی ہوئی آنکھوں سے نیند رات بھر کھلواڑ کرتی رہی۔ میں نے بھی خود کو اس بستر پر ایسا پڑے رہنے دیا جیسے میں بھی اس بستر کی چادر یا تکیہ ہوں۔ سوچیں میرا ساتھ دے رہی تھیں۔ جن میں لپٹی ہوئی موسیٰ کی یاد، جو کسی بھی وقت کسی بھی سمت سے میرے پاس

آ کھڑی ہوتی تھی۔ اور میری زندگی کو راستہ دینے سے روکتی تھی۔

آج کا دن بہت عجیب شروع ہوا تھا، حیرت میں ڈوبا ہوا۔ میں جہاں تھی وہ میرا علاقہ نہیں تھا۔ لیکن بظاہر وہ مجھ سے منسوب تھا۔ میرا گھر میرا شوہر، سب کچھ خود میرے لیے سوالیہ نشان بناتا ہوا۔ تعلق کا کوئی احساس دور دور نہیں تھا بس ایک مضطرب کر دینے والی بے بسی تھی اور اختیار سے باہر میری سوچیں جو مجھے جس راستے پر اب لے جانا چاہتی تھیں وہ مجھے تنہائی کے نا آشنا جنگل میں پھنسا رہی تھیں۔

میں دیر تک بستر پر لیٹی کمرے سے باہر کسی آواز اور حرکت کا انتظار کرتی رہی۔ اب میرے لیے کیا فیصلہ ہوگا۔ مجھے یہاں رکنا ہوگا یا رات کی بے ہنگم شروعات کا خمیازہ میرے حصے میں آئے گا۔ میں نے بے زار کن خاموشی سے باہر نہ آنے کا کوئی راستہ پا کر پھولوں سے بجی چھت کے پھول گننا شروع کر دیے۔ چھوٹے چھوٹے انگنت کئی رنگوں میں جن کی خوشبو کا مجھے ابھی تک احساس بھی نہیں تھا، اب میری ناک میں اپنے ہونے کا احساس دلانے کے بعد مجھے خود کو دیکھنے پر آمادہ کر رہے تھے۔ میں انہیں گن رہی تھی ان کی لڑیاں مثلث کے شکل میں جوڑی گئی تھیں میں انھیں سو تک گن چکی تھی۔ دروازہ کسی نے زور سے تھپتھپایا۔ میری گنتی ٹوٹ گئی، پھولوں کو گنتے ہوئے مجھے وہ رنگ برنگے چہرے نظر آنے لگے تھے جو کسی میلے میں اپنا منھ رنگ کر گھومتے ہیں اور اپنی اداؤں سے لوگوں کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔ دل کے فرش پر بچھی ہوئی اداسی پر ایک نرم اور ملائم کر دینے والا سکون سا پھیل رہا تھا جو اس تھپتھپاہٹ نے روک دیا۔ میری آنکھوں میں شاید وہی چمک ہوگی جو اندر آنے والے نے دیکھی ہوگی۔

''صبح بخیر'' ان آنکھوں میں کوئی شکوہ نہیں تھا، نہ چہرے پر میرے لیے ملامت کے آثار مجھے ملے۔

میں نے اپنا سر بستر کے تکیے سے اٹھا کر مسہری کے خوبصورت کونے پر رکھ دیا جو میری ماں نے بڑے چاؤ سے میرے لیے بنوائی تھی اور جس کے بارے میں وہ مہینہ بھر

سے آنے جانے والوں سے کچھ نہ کچھ کہتی رہتیں تھیں۔ میری اہمیت سے زیادہ اس جہیز کی اہمیت تھی جو مجھے دیا جا رہا تھا۔ بعض دفعہ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے ماں میری حالت کو چھپانے کے لیے یہ جہیز دے رہی ہو اور سب کی توجہ اس طرف ہی رکھنا چاہتی ہو۔ ان سب کو بھی جو مجھ سے ناتا جوڑنے کے لیے میری زندگی میں داخل ہو رہے تھے۔ آنے والا مسہری کے کونے پر ہی کھڑا رہا۔

''تم ناشتہ کرلو۔ اور جو لے جانا چاہتی ہو لے جاؤ۔ باقی سامان میں تمھارے بعد بھیج دوں گا۔''

اس کے الفاظ مجھے سنائی دے رہے تھے ایسے جیسے کوئی آبشار اپنی جلترنگ کے ساتھ بہہ رہا ہو۔ پھولوں کی گنتی کرتے ہوئے جو فضا میری آنکھوں میں استوار ہوئی تھی وہ اب میرے دل میں اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ میں نے بستر سے کود کر فوراً بھاگنے کی آمادگی کو شدت سے روکا۔ میری آنکھوں میں امڈتے ہوئے تشکر کو اس نے پڑھ لیا ہوگا۔ ''ایسا ہوتا ہے۔''

''تم موسیٰ کی تلاش میں ہو اور میں موسیٰ نہیں ہوں۔ اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ موسیٰ کو میں اپنے اور تمھارے درمیان زندگی گزارتے ہوئے دیکھ سکوں اگرچہ کہ یہ واہمہ ہے لیکن تمھارا دل اس سے لبریز ہے جو میں خالی نہیں کر سکتا۔ تم ایک جیتی جاگتی حقیقت ہو، اپنے اس دل کے ساتھ۔''

میرا دل بلّیوں اچھل رہا تھا میں اس غیر متوقع، اتنی جلدی اپنے لیے تبدیل ہونے والے حالات کے بارے میں غیر یقینی حالت میں اپنے دونوں ہاتھ زانو پر رکھے بیٹھی تھی جو اس طرح لرز رہے تھے کہ میں چھپانے کا ڈھونگ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ناشتہ میرے سامنے اب آ گیا تھا۔ ناشتہ لانے والی عورت نے مجھے یوں دیکھا تھا جیسے میں اس جہان کی مخلوق نہیں ہوں۔ ناشتہ رکھ کر جاتے ہوئے مجھے دیکھنے کے لیے اس کو اپنی گردن گھمانے کے لیے جب مڑنا پڑا تو میری نظروں نے بھی اس کو ایسے ہی دیکھا جیسے نامانوس فضا میں کوئی پرندہ قید ہو کر اڑنے سے پہلے دیکھتا ہو، وہ جلدی سے پردے کے پیچھے

غائب ہو گئی۔ میں ناشتہ کیا کرتی۔ ہر چیز بدلی لگ رہی تھی۔ اس موہوم سی آزادی نے مجھے اس دنیا سے پرے کر دیا تھا جو اب تک مجھے ایک گھٹن میں موسیٰ کے ساتھ دوڑاتی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے اور موسیٰ کے درمیان اس کھلے میدان میں بس اب کوئی نہیں ہوگا۔ میرے اندر ایک ہنسی نے پہلی بار جنم لیا جو مجھے حیران کر گئی اس ہنسی کی آواز میرے دل نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔

کشادگی کے ماحول میں میں اپنا سامان بٹور رہی تھی۔ میرا پرس، میرے جوتے اور خود میں، میں ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر سب کچھ لے جانا چاہتی تھی۔ کوئی ملامت بھی نہیں، کوئی پشیمانی اور نہ ہی اس کمرے کی فضا میں اپنی کوئی خوشبو۔

''تمہیں کوئی لینے نہیں آئے گا؟ اس نے سوال کیا۔''

''پتہ نہیں۔''

''ہو سکتا ہے جو وقت انھوں نے طے کیا ہو، اس وقت کا میں انتظار نہیں کر سکوں۔''

''ہاں۔ تم جا سکتی ہو دیر یا بدیر جانا تو تھا۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس دروازے تک جا پہنچی اور باہر نکلنے لگی اس کو الوداعی اور شکر گزار نظروں سے دیکھتی ہوئی۔ باہر میں اس طرح کھڑی تھی جیسے کوئی نئے شہر میں یا نئے ملک میں داخل ہوا ہو اور سوچ رہا ہو کہاں جانا ہے۔ میں بھی ایک لمحے کے لیے لڑکھڑائی، کہاں جانا ہے۔ لیکن نہیں مجھے راستہ معلوم تھا۔ میں جس راستے پر جا رہی تھی وہ میرے اس گھر کا تھا، جس کے پاس ایک میدان تھا، جس کے ایک کونے میں وہ گڑھا تھا جس کو کھودنے کا کام مجھے موسیٰ سونپ گیا تھا۔

(۳)

گھر میں قدم رکھنے سے پہلے میں سوچ رہی تھی اماں جو کل میرے شادی کا جشن منا رہی تھیں آج جب مجھے واپسی کے راستے پر ہمیشہ کے لیے دیکھیں گی تو کیا ہوگا۔ ان

کا وہ تمام اثاثہ جو اپنے خوابوں سمیت انھوں نے مجھے سونپ دیا تھا میں کہیں پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ میرا دل چاہا میں کسی ہوٹل میں ایک کمرہ بک کرا کر کچھ عرصہ وہاں گزاروں لیکن پھر مجھے ابا کا خیال آیا جو کسی بھی صورت میں مجھے دیکھنا چاہتے ہوں گے۔ اور وہی ہوا گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ابا ہی میرے سامنے آئے۔ میرے چہرے پر خاموشی کا جو ہیبت ناک سناٹا گھر میں گھسنے سے پہلے اماں کی اذیت کا سوچتے ہوئے رینگ رہا تھا۔ ابا کو نظر آ گیا ہو گا۔

''ہوں! تو تم آ گئیں۔''

''جی ابا!'' میں نے جوتے اتارنے کے لیے کمرے کا رخ کیا اماں اپنی کیاری سے میرے لیے جوہی اور موتیا کے پھول چن رہی تھیں میری آواز سن کر لپکیں۔

''ارے، میں تم کو خود لینے آ رہی تھی۔ تم تو وہی۔۔۔'' میں ابھی تک وہی سوٹ پہنے تھی جس پر اماں نے اپنے حساب سے انتہائی قیمتی موتیوں سے لہریے ڈلوائے تھے۔ جس کا رنگ سرخ تو تھا لیکن اس میں بنفشئی عکس بھی اپنا کمال دکھا رہا تھا۔ جو میرے لیے اب تکلیف کا باعث تھا، وزنی اور اور بیزار کن۔ اماں میرے پیچھے دروازے سے باہر کچھ دیکھنے کو لپکیں ابا نے انھیں انتہائی دبی لیکن کشادہ آواز میں پکارا۔'' وہاں کوئی نہیں ہے۔ واپس آ جاؤ۔''

''کیوں؟'' اماں نے کیوں کے سوال کو غیر یقینی آواز میں پوچھا۔

''یہ پوچھنا اب بیکار ہے جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔''

''کیا ہونا تھا؟''

رات کا خوف اور آرسی مصحف میں میرے حلق سے نکلنے والی آواز شاید وہ ابھی بھولیں نہیں تھیں۔ لیکن اپنے دل کو بہلا رہی تھیں۔ گھر میں اکا دکا مہمان ابھی موجود تھے۔ اماں کی آواز دھیمی تھی، لیکن تھرائی ہوئی: ''تم اکیلی آئی ہو؟''

''جی! ابھی نہیں جانے کے لیے۔''

میں نے اپنے حلق سے یہ جملہ نکالا جس میں ''کبھی نہیں'' مصمم ارادے کا پتہ دے رہا تھا۔

اماں کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ ''وہ تو مجھے رات میں ہی پتہ چل گیا تھا جب تم نے سب کے سامنے ہمیں شرمندہ کیا تھا۔''

''بس'' ابا نے بس اس طرح کہا گویا ایک لوہے کی دیوار کھڑی کر دی ہو۔ میں نے ابا کو دیکھا جو پریشان نہیں تھے لیکن ان کی آنکھوں میں ہو سکتا ہے میرے آنے والے دنوں کا خوف ہو۔ جو ہونا چاہیے تھا۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا، میں نے اپنے ماں باپ کو کیسے امتحان میں ڈالا تھا۔ وہ میرے عذاب دیکھ رہے تھے اور مجھے تنہا بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ جب کہ میں تنہائی کی گود میں سر رکھ کر سونا چاہتی تھی۔ اماں گھر کا سارا سامان ایسے اٹھا رہی تھیں جیسے رات میں شب خون مارا گیا ہو، میں اماں کے چہرے کی شکن پر چڑھی ہوئی غم ناک اداسی کو دیر تک دیکھتی رہی پھر اپنے کمرے میں خود کو بستر پر گرا دیا گہری نیند نے نہ جانے کب مجھے دبوچ لیا۔ جس میں کوئی ڈراؤنا خواب بھی نہیں تھا جس میں صرف اندھیرا تھا جو ایک گہری نیند کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

جب میری آنکھ کھلی گھر میں ہمیشہ کی طرح خاموشی تھی۔ بیچ میں شادی کے دنوں کے دوران کے ہنگامے نے گھر کا نقشہ بدل دیا تھا۔ وہی سکون اور ماں باپ کے قدموں کے چلنے کی آواز جو اکثر مجھے اپنے کمرے کے ارد گرد ہی سنائی دیتی تھی، میں اپنی موجودگی کو کس طرح ان تک لے کر جاؤں، میں نے آنکھ کھلتے ہی سوچنا شروع کر دیا تھا۔ نیند نے میرا ساتھ خوب دیا تھا اب میں ایک تازہ اور ہلکی سی ہوا میں خود کو محسوس کر رہی تھی جو ایک موہوم سی ٹھنڈک میرے جسم میں پیدا کر رہی تھی۔ بستر سے اتر کر میں بے آواز چاپ سے باہر نکلی۔ باہر سناٹا تھا۔ وہ دونوں اپنے کمرے میں تھے۔ میں کمرے کے دروازے پر رک گئی۔ اماں کی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔

''اب کیا ہوگا؟'' اماں کبھی کبھی اس سوال کے ساتھ اپنی سسکی کو ملا دیتی تھیں۔
اور ابا نہ جانے کیا کر رہے تھے۔ میں نے کمرے میں جھانکا۔ ابا بستر پر لیٹے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے چھت تک رہے تھے، مجھے نظر نہیں آ رہا تھا، ان کے چہرے پر سکون تھا یا بے سکونی۔ ہاں اماں کی تو آواز ہی بیٹھیا نکل رہی تھی۔ میں دبے پاؤں اماں کے پہلو میں جا کر بیٹھ گئی۔ اگر میں اماں کو اپنا دل دکھا سکتی جس کے ہاتھوں اماں کو یہ سب دیکھنا پڑ رہا تھا تو شاید وہ کبھی نہیں روتیں میرے ہمیشہ کے لیں گھر آ جانے پر۔ لیکن ابا شاید سنبھل چکے تھے۔ مجھے اماں کے قریب بیٹھا دیکھ کر پر سکون لہجے میں بولے: ''تم تو خوب سوئیں۔ میں کئی بار تم کو اٹھانے گیا۔ لیکن مزے کی نیند میں تھیں، بہت دنوں جاگنے کے بعد ایک اچھی نیند بہت ضروری ہوتی ہے۔''
میں نے دیکھا اماں تڑپ کر ابا کو گھورنے لگیں۔ پھر انھوں نے میرے چہرے پر نظر ڈالی، جو دیر تک ٹکی رہی۔ میں نے ان کو گھورتے دیکھ کر سر جھکا لیا تھا۔ اماں میرے قریب سرک آئیں۔ ''مجھے صرف اس بات کا دکھ ہے کہ ہمارے بعد تم کیا کرو گی۔'' اماں کی آواز ممتا سے لبریز میرے کانوں میں سیسہ انڈیل رہی تھی۔ اور میں اماں کی آواز کی سمت رواں دواں تھی جہاں صرف تنہائی تھی
اور موسیٰ کی تلاش کا راج تھا۔

(۴)

وقت اب تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ اماں اس گھر کو بیچنے پر تلی ہوئی تھیں جس کی بالکونی میں، میں راتوں کو گھنٹوں کھڑی رہتی تھی اور اپنے خیال میں وہاں ننھے ننھے جگنوؤں کو ٹمٹماتے ہوئے دیکھتی تھی۔ اماں میرے پاگل پن کو روکنے کا ایک یہی راستہ ڈھونڈ پائی تھیں، جو روگ مجھے بچپن سے لگا تھا اس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا لیکن وہ بیماری کی شکل اختیار کر چکا تھا اور پے در پے مجھے

نقصان پہنچا رہا تھا۔ اب زمانہ بھی میرے ساتھ نہیں تھا۔ سب کے لیے میں سوالیہ نشان بن چکی تھی۔

اور خاص طور پر اپنے ماں باپ کے لیے جو میری بیماری کو بڑھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ درمیان کے کسی بھی واقعے نے مجھے موسیٰ کی تکرار سے باہر جانے نہیں دیا۔ اور میں اس یقین کی زندگی کے بیچ جی رہی تھی کہ ایک نہ ایک دن میں موسیٰ سے ضرور ملوں گی جس کے نقوش بھی میں اب بھلائے دے رہی تھی۔ اور یہ ساری باتیں اس کو بتاؤں گی جو اس کے جانے کے بعد میں نے جھیلیں ہیں۔ مجھے پتہ تھا وہ ہنسے گا اور ہنستا چلا جائے گا۔ اس کی کھوج میں جو جو بے وقوفیاں مجھ سے سرزد ہوئی ہیں۔ لیکن وہ اب کہاں ہوگا۔ کیا مجھے اسی طرح یاد کرتا ہوگا، کیا اس کو یقین ہوگا کہ میں اس ایک یاد میں زندگی گزارنے پر تل گئی ہوں۔ اور ایک ہی دائرے میں گھوم رہی ہوں میں اور موسیٰ، موسیٰ اور میں۔

(۵)

وقت ایک شطرنج کی بساط کی طرح میرے سامنے بچھا ہوا تھا۔ اور میرا مخالف کھلاڑی موسیٰ تھا۔ وہ مجھے مات پر مات دے رہا تھا لیکن میں بھی ڈٹی ہوئی تھی ایک ایک لمحے کی منظرکشی میرے لیے بہت مشکل ہے میری کھوجتی ہوئی آنکھیں اور زمین کھودتی ہوئی انگلیاں۔ اب ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ اماں ابا اچانک میری زندگی سے غائب ہو گئے تھے۔ میری زندگی کا سناٹا ان سے برداشت نہ ہو سکا۔

(۶)

اب بھائیں بھائیں کرتا گھر تھا، اور میں تھی۔ میری انگلیاں اب زمین کھودنے کا حوصلہ ہارتی جا رہی تھیں۔ اب نہ اماں کی حوصلہ شکن آوازیں تھیں اور ابا کی مطمئن نظریں جو میرے گرد دائرہ بناتی رہتی تھیں، اب دور ہو گئیں تھیں۔ میں نے موسیٰ سے بات کرنا

چھوڑ دیا تھا۔ اب میں تنہا رہنا چاہتی تھی، بالکل تنہا۔ میں اس خزانے سے موسیٰ کو حصے دار بنانے کا ارادہ بھی ترک کر چکی تھی۔ میں اب موسیٰ کے خیال سے نفرت کرنا چاہتی تھی۔ میری انگلیاں زخمی ہو چکی تھیں۔ وہ مجھے اس گھناؤنے کام میں لگا گیا تھا اور مجھے بھول گیا تھا۔ خزانہ حاصل کرنے کا ناقابل برداشت بوجھ اور کھوجنا۔ اس خزانے کی صرف میں حق دار تھی۔ موسیٰ مجھے مل بھی گیا تو میں اس کو یہ خزانہ نہیں دوں گی، اگر میں نے اسے کھود لیا تو۔

(۷)

یہ کہانی لکھتے ہوئے میں دیکھ رہی ہوں میری انگلیاں ضائع ہو چکی ہیں۔ شاید میں اس کہانی کو مکمل نہ کر سکوں ان حادثوں کے درمیان جو پے در پے میری زندگی میں دندناتے رہے۔ اور مجھے حیران کرتے رہے۔

اس زمین کو چھوڑ کر جہاں میں یہ خزانہ کھود رہی تھی۔ میں نے خود کو دوسری جگہ پہنچا دیا۔ میں نے اپنے اندر حال میں زندہ رہنے کی خواہش پیدا کی۔ ایک اچانک تبدیلی جس نے مجھے اس جگہ کو چھوڑنے پر اکسایا تھا۔

لیکن مجھے پتہ نہیں تھا وقت میرے ساتھ کون سا کھیل کھیلنے جا رہا ہے۔

(۸)

میں پہلی بار ایک نئی زمین پر اتر رہی تھی زمین پر میرا جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ مسافروں کی قطار میں چلتی ہوئی، سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی ہوئی، انجانے دیس میں، نہ جانے کیوں میں اس دن خود کو تنہا محسوس نہیں کر رہی تھی۔ فضا کی تبدیلی نے مجھے گھیر لیا تھا۔ پہلی بار میں بہت ہلکے سروں میں گنگنا رہی تھی۔ اجنبیت کی دھیمی اور نئی ہوائیں مجھے ایک سکون سے دوچار کر رہی تھیں۔ ایک دن ایسا بھی ہوتا ہے جب کوئی غم، کوئی ملال دل کے کناروں کو آلودہ نہیں کر رہا ہوتا، میں سوچ رہی تھی۔ اور رکے رکے قدموں سے اس نئی

زمین کی طرف آگے قدم بڑھا رہی تھی۔ مجھے ابھی کوئی ایسی جگہ ڈھونڈنی تھی جہاں کچھ دن گزار سکوں اس ملک کو جاننے کے لیے۔ میرے ساتھ ساتھ قدم ملا کر چلنے والے نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا: ''سامان کیا زیادہ ہے میں اٹھالوں؟'' میں نے پلٹ کر دیکھا، میرے ساتھ چلنے والا اجنبی۔ میرے قدم اور تیز ہو گئے میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر تھینکس کہا اور آگے آگے جانے لگی۔ پیچھے پڑ جانے والے نے پھر میرے قدموں سے قدم ملا کر چلنا شروع کر دیا۔

''کوئی لینے آیا ہے؟''

نہیں، میں نے اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔

''پھر کیسے جائیں گی۔ یہاں ٹیکسی ملنا مشکل ہے۔ آپ کے پاس کوئی نمبر ہے؟''

''میرے پاس موبائل ہے۔''

''میرے پاس موبائل نہیں ہے۔'' میں نے چڑ کر کہا اور قدموں کو اور تیز کر دیا۔

اس کے قدم سست پڑنے لگے۔ اب وہ میرے پیچھے تھا لیکن اس نے اپنا راستہ نہیں بدلا تھا۔ ایئر پورٹ سے باہر آئے مجھے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ وہ پیٹھ موڑے مجھ سے ذرا فاصلے پر دور کھڑا تھا۔ وہ کون تھا، کیسا تھا میں نہیں جانتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں پچھتائی۔ میں یہاں کیوں آ گئی۔ دور دور کوئی آشنائی نہیں۔ اگر چہ مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی، مگر کوئی تو ہو جو راستہ بتائے۔ میں سوچ رہی تھی اور آہستہ آہستہ آگے کی جانب بڑھ رہی تھی، آگے جہاں ایک لمبی سڑک میرا منھ تک رہی تھی کہ میں اس پر اپنے قدم بڑھاؤں۔ میں نے چاروں طرف کی فضا میں نظر دوڑائی، سرد ہوا اور آسمان پر تنتے ہوئے بادل بھی مجھے اپنے اجنبی ہونے کا پتہ دے رہے تھے۔ میں ابھی تک اپنے ملک کا لباس پہنے تھی جہاں گرمی اور خشک ہوائیں تھیں۔ میں سوٹ کیس کے بوجھ کو اپنے ہاتھوں سے آزاد کیا اور اپنے کندھے پر پڑے گرم کوٹ کو پہن لیا۔ میں نے پھر آگے بڑھنے کے لیے قدم آگے بڑھانا چاہے۔ اس بار کسی کی آواز بالکل میرے کانوں کے پاس میری کانوں

کی لو سے ٹکرا رہی تھی: ''تم بلا وجہ پریشان ہو رہی ہو۔ چلو میں چھوڑ دوں کہاں جانا ہے؟''

کہاں جانا ہے؟، میں سوچ رہی تھی اس آواز کو سننے کے بعد جس کا چہرہ اب تک میں نے نہیں دیکھا تھا۔

''لاؤ، لاؤ'' وہ میرا سامان میرے ہاتھوں سے گھسیٹ رہا تھا۔ جھکی ہوئی گردن سے اس نے مجھے احتجاج سے دیکھا۔ ''میرے پاس گاڑی ہے۔ میں تم کو صحیح جگہ اتار دوں گا۔''

مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں، میں اس کے احتجاج پر حیران تھی۔ یہ مجھے اکیلا جان کر یہ خدمات پیش کر رہا ہے لیکن اس دوران میں اس کے چہرے پر نظریں گاڑ چکی تھی۔ فضا میں نمی اور ٹھنڈک اس کی ناک سرخی کی طرف مائل تھی۔ آنکھیں ایک گہرے سکوت میں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اور ہاتھ مستعدی سے میرے سامان کو اٹھانے پر تلے ہوئے تھے۔ ''تم، تم کون ہو، موسیٰ۔ آر یو موسیٰ؟''

''نو آئی ایم نوٹ موسیٰ۔''

''لیس یو آر موسیٰ۔''

سامان اٹھانے والا گھبرا چکا تھا۔

''تم نے یہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا، میں یہاں تمھاری وجہ سے بھاگ کر آئی ہوں۔ میں تم کو ڈھونڈوں یا تم سے پیچھا چھوڑاؤں۔ تم نے میری زندگی اس گڑھے کی طرح کر دی ہے جو آج بھی نامکمل ہے تمھارے ارادوں کی طرح۔''

''لیکن میں موسیٰ نہیں ہوں،'' وہ سامان چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔

میں دیکھ رہی تھی اس کے چہرے پر پھیلی حیرانی۔ ''موسیٰ تم کو لینے نہیں آیا۔ اتنی سے بات ہے۔''

''لیکن تم جھوٹ بول رہے ہو، تم موسیٰ ہو۔''

وہ ہنسنے لگا۔

''پاگل ہو گیا؟ میں موسیٰ نہیں ہوں۔''

اور میں سوچ رہی تھی اس نئی زمین پر بھی موسیٰ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ میں اداس ہو کر آگے بڑھ گئی۔

''آر یو الون؟''

''یس، میرا دوست موسیٰ مجھے لینے نہیں آیا۔''

اب میں کیا کہہ رہی تھی، کیوں کہہ رہی تھی مجھے نہیں معلوم تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا میں اس کے جواب دے رہی تھی۔

''تم میرے ساتھ چل سکتی ہو۔''

''کہاں؟''

''میرے ساتھ میرے گھر۔ پھر ہم مل کر موسیٰ کو ڈھونڈیں گے۔'' وہ مجھے اطمینان دلا رہا تھا۔ ''اس شہر میں آدمی کو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔''

وہ مجھے یہ کہہ کر ساتھ ہی ساتھ یہ یقین بھی دلا رہا تھا کہ وہ موسیٰ نہیں ہے۔

میں نے چمکتی ہوئی سڑک کے دونوں طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''تمہیں کچھ یاد نہیں۔ ہمیشہ کی طرح تم میرے یقین کا مذاق اڑا رہے ہو۔ تم مجھ سے اپنا حلیہ پوچھ رہے ہو۔''

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ گھونگریالے بال، نوکیلی ناک اور آنکھیں جن میں انتقام اور نفرت۔ اس نے گھبرا کر اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا پھر اپنے بالوں پر پھر اپنی ناک کی نوک کو دو انگلیوں سے پکڑ لیا۔

''لیکن یہ میں تو نہیں ہوں۔ نہ میرے بال ایسے ہیں جیسے تم بتا رہی ہو۔''

ہاں ہو سکتا ہے۔ موسیٰ کا حلیہ تو کھو یا گیا ہے۔ جو یاد ہے وہ بتا رہی ہوں۔ وہ مجھے مشتبہ نظروں سے گھورنے لگا۔ اور میں اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی، موسیٰ کا حلیہ اسے

بتاتی ہوئی اس کے گھر تک جا پہنچی تھی۔ وہ اکیلا ایک اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ اور میری حالت سے شاید اب پوری طرح خائف تھا۔

(۹)

بہت دن گزر گئے میں اسے موسیٰ کہتی رہی اور وہ مجھ سے موسیٰ کا پتہ پوچھتا رہا۔ اس کے انکار نے مجھے بیمار کر دیا تھا۔ اس دن مجھے بہت تیز بخار تھا وہ میری تیمارداری میں لگا تھا۔ میرے سرہانے کرسی رکھے بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔

''تم اپنا علاج کراؤ۔'' میں بخار میں پھنک رہی تھی۔

تم میرا علاج کروا تو رہے ہو۔ میں دوا پی رہی ہوں۔ اب بخار نہیں اتر رہا تو میں کیا کروں۔''

''نہیں، اپنی مینٹل حالت کا۔''

''کیوں، مجھے کیا ہو گیا؟''

''ارے تم ایک الیوژن کے پیچھے بھاگ رہی ہو اور جس کو چاہتی ہو موسیٰ سمجھ بیٹھتی ہو۔''

یہ سراسر الزام تھا۔ میرا دل اور پھنکنے لگا۔ ''ہاں، میں چاہتا ہوں کہ ایسا ہو۔ تاکہ تم اس سے نجات حاصل کرو۔'' وہ مجھے ابنارمل سمجھ چکا تھا اور میرے درد سے واقف۔

اور ویسا ہی ٹریٹمنٹ کر رہا تھا۔ میں اب اس جگہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔

'' تو تم موسیٰ نہیں ہو، پھر میں یہاں کیوں ہوں۔ مجھے جانا ہے۔'' میں بخار میں بڑبڑا رہی تھی۔'' مجھے خزانہ بھی تو کھودنا ہے۔''

''خزانہ کیسا؟''

وہ اور گھبرا گیا تھا۔

''جو موسیٰ کھود رہا تھا۔''

''اب میں جان گئی تم موسیٰ نہیں ہو۔تم موسیٰ ہوتے تو یہ سوال نہیں کرتے۔''
''کیا تم واقعی پاگل ہو؟'' اس نے مجھے الوداعی بوسے میں جھنجھوڑ کر کہا تھا۔
''جاؤ!شاید تم کو موسیٰ مل جائے،شاید وہ وہاں ہی ہو جہاں اس نے تم کو چھوڑا تھا۔''

(۱۰)

ایک بار پھر میرا گھر،میری فائلیں اور میں تھی۔کئی دنوں سے اب ایک چیز میں اضافہ ہوگیا تھا اور وہ میرا آئینہ تھا۔جس کے سامنے کھڑے ہو کر میں کام سے واپسی کے بعد موسیٰ سے باتیں کرتی تھی۔اور ایسی وقت میں جب مجھے کوئی کام نہیں ہوتا تھا میں اس مہم پر جٹ جاتی تھی جو موسیٰ مجھے دے گیا تھا اب زمین کھودنا میرے لیے ایسا ہی تھا جیسے وہ میری زندگی کا اہم کام ہو۔اگرچہ کہ میں اپنی انگلیوں کے ضائع ہونے کے دکھ میں بھی مبتلا تھی۔اور خود کو دن بہ دن معذور ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔اب اماں کی آنکھیں بھی نہیں تھیں میرا دکھ دیکھنے کے لیے،میں خود ہی اس دکھ کا بوجھ اٹھا رہی تھی۔

بالکل اس طرح جیسے شام کے سائے پھیل کر دیوار کو خود بخود سیاہ کر دیتے ہیں اور منڈیروں پر اچکتی چڑیاں اداس ہو جاتی ہیں۔میں بھی وقت کے گزرنے کا احساس لیے اب طویل سنسان زندگی سے اکتاہٹ محسوس کر رہی تھی۔اب ایک بدمزگی مجھے نچوڑ رہی تھی۔جو مجھے اور تنہائی کی سمت ڈھکیل رہی تھی۔ایک محدود دنیا،جس میں ایک آئینہ تھا، اور اس کے سامنے میں تھی۔جہاں کبھی کبھی موسیٰ اپنی کرخت مسکراہٹ کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا۔سوائے اس آئینے کے،کوئی میری آواز سننے والا نہیں تھا۔نہ مجھے کوئی آواز دینے والا تھا۔پھر بھی تنہائی اور موسیٰ کی یاد کے اس مدار میں خاصا وقت کٹ چکا تھا۔ میری کہانی جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے،خود میرے لیے ناقابل بیان ہوتی جا رہی ہے۔ اور جس نام کے پیچھے بھاگ رہی ہوں وہ نام میرے ساتھ ایسے ہی چمٹ گیا تھا جیسے میں کسی موذی بیماری میں مبتلا ہوں،جو اب کسی کے بس میں نہیں ہے اور ہزار علاج معالجے

کے بعد بھی اس سے نجات ناممکن ہے۔ کبھی کبھی اپنے سنسان برآمدے میں پرانے گملوں میں پانی دیتے ہوئے اور خزانہ کھودتے ہوئے میں نے اپنے بارے میں ایسے ہی سوچا جیسے کبھی میرے ماں باپ سوچتے تھے کہ میرا راستہ کیا ہے، میں کس طرف جا رہی ہوں، کب ختم ہوگا میرا یہ سفر۔ کیوں یہ سب میں اپنے ساتھ کر رہی ہوں؟ لیکن دوسرے لمحے ہی موسیٰ کی شدید اور بے تابانہ یاد مجھے کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ہی ناہموار کر دیتی تھی۔ اور میں ان پتھریلے راستے پر پھر چل نکلتی تھی۔

(۱۱)

مجھے یاد ہے ایک بار انتہائی بارش میں، میں اور موسیٰ دوڑ رہے تھے۔ ہمارے گھر سے دور ایک گراؤنڈ میں تماشا دکھایا جا رہا تھا۔ میں نے اماں سے موسیٰ کے لیے بھی پیسے لیے تھے میری مٹھی میں دو نوٹ تھے ہم بھاگ رہے تھے: ''تماشا شروع ہونے والا ہوگا،'' میں نے تیز ہوتی ہوئی بارش میں موسیٰ کے ساتھ دوڑتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، ہونے والا ہوگا۔'' وہ بھی دم لگا کر بھاگ رہا تھا۔ جتنی محنت ہم اس بھاگنے میں کر رہے تھے وہ مجھے آج بھی یاد ہے لیکن جب ہم وہاں پہنچے، تو دروازہ بند ہو چکا تھا۔ تماشا شروع ہو چکا تھا ہم دونوں نے ایک دوسرے کو افسوس سے دیکھا۔ موسیٰ پانی میں شرابور میری مٹھیوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور اچانک ایک بے ہنگم آواز اس کے حلق سے نکلنے لگی۔ وہ اس کی ہنسی کی آواز تھی۔ وہ اس بارش میں ہنس ہنس کر دہرا ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی مٹھی کی طرف دیکھا۔ میری مٹھی میں تھمے ہوئے نوٹ پانی میں گلے ہوئے کاغذ کی طرح ٹپک رہے تھے میں نے جل کر، نوٹ جو بچ گئے تھے، موسیٰ کے منھ پر دے مارے تھے۔ مجھے اس کی ہنسی اس وقت بہت بری لگ رہی تھی۔ اور واپسی میں وہ بارش اور ہوا ہمارے لیے ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔

یہ دوڑ جو میں نے موسیٰ کے پیچھے لگائی ہوئی ہے اس سے پلٹ کر جانا اب میرے

لیے مشکل ہے اس لیے کہ یہاں سے پلٹتے ہوئے موسیٰ میرے ساتھ نہیں ہوگا۔

(۱۲)

وہ رات بہت گزر چکی تھی۔ ایک کتاب پڑھتے ہوئے مجھے رات کے گزرنے کا پتہ نہ چل سکا۔ نرم اور ٹھنڈی ہوائیں میرے بستر کو چھو رہی تھیں ساری فضا میں ایک غنودگی اور نمی سی تھی۔ جس میں میرا جسم جاگ رہا تھا۔ میرا جسم جو ایک عرصے سے لپٹے ہوئے لحاف کی طرح دبکا پڑا تھا۔ عرصہ دراز سے ایک بیزاری جو مجھے کچھ دیکھنے نہیں دیتی تھی، چھٹ سی رہی تھی۔ میں نے لیمپ کی روشنی پر سے شیڈ کو اونچا کر دیا۔ روشنی سارے کمرے میں بکھر گئی۔ میں نے خود بخود ایک انگڑائی لی۔ غیر مانوس سی انگڑائی ایک جمائی کے ساتھ لیکن یہ جمائی بے زاری کی نہیں تھی۔ شیڈ ہٹتے ہی میرا سراپا آئینے کے سامنے تھا۔ اچانک خود پر میری نظر پڑی۔ ایک طویل عمر میں نے اپنے آپ کو دیکھے بغیر گزار دی تھی۔ میں نے خود کو آئینے کے سامنے اجنبی پایا۔ بہت اجنبی۔ اس اجنبیت کے ساتھ ساتھ ایک احساس جو میرے جسم میں رینگ رہا تھا۔ وہ احساس جو میرے جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبو کا تھا۔ ایک بھینی اور بہت دور سے آتی ہوئی خوشبو۔ جو میرے جسم کے اوپر آہستہ آہستہ بھنور کی شکل اختیار کر رہی تھی جیسے ریت کا بگولا ہوا کے زور سے زمین سے اوپر گول دائرے میں اٹھتا چلا جاتا ہو۔ آئینے میں، میں اپنے جسم کی اس کیفیت کو دیکھنا چاہتی تھی، یہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ بگولا مجھے چھو رہا ہے۔ میرے بازو، میری آنکھیں، میری گردن، میرے بال۔ اور کہلوا رہا ہے مجھ سے، یہ میں ہوں؟ میں ایک حیرت اور پہچان کے دوران خود کو دیکھ رہی تھی۔ میرے جسم کے چاروں طرف اٹھتی خوشبوؤں کا بگولا جو مجھے مجھ کو دیکھنے پر اکسا رہا تھا۔ آج یہ ہوا کیسی چل رہی ہے؟ اب یہ میں خود سے پوچھ رہی تھی۔ ایک ہلچل جو آہستہ آہستہ مجھے جیسے ہوشیار کر رہی تھی۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے تو یہ سب کبھی نہیں ہوا۔ بس اداسیوں کا راج تھا جو میری جسم کی کھال تک میں

پیوست ہو چکیں تھیں۔ میں نے آج اپنے بالوں کو دیکھتے ہوئے بنایا پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ میرے بال کتنے خوبصورت ہیں۔ میری آنکھیں، میرے ہونٹ۔ میں دیر تک خود کو سراہتی رہی۔ اور نامعلوم تازگی میں اپنے آپ کو لپٹا دیکھتی رہی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ میں ہوں۔ میرے جسم سے اٹھتی خوشبوئیں بہت دیر تک مجھے ان جانی بشاشت میں ٹھہرے رہیں۔ اس احساس کی طوالت نے جسم کی بیداری کو ایک اور نئی شکل دی، میں نے خود کو انگڑائی لے کر بستر پر گرا دیا۔ اور آنکھیں موند لیں اور اس کیفیت کی سرخوشی میں دیر تک پڑی رہی۔ پھر اس فضا کی نمی نے جس نے مجھے اس حالت میں پہنچایا تھا مجھ پر ایک غنودگی سی طاری کر دی۔ شاید میں نیند میں تھی۔ اچانک مجھے سنائی دیا کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ پہلے یہ وہم لگا۔ کون ہو سکتا ہے۔ کون میری اس اجنبیت کو دیکھنے آ گیا۔ دروازے پر دستک بڑھتی گئی۔ میری نیند نے مجھے اٹھنے سے روکا۔ یہاں کون آ سکتا ہے۔ کون مجھے جانتا ہے۔ وقت کے اس مرحلے میں جب میں پہلی بار خود سے ملی ہوں، کوئی یہ جان گیا ہے۔ کہ اسے مجھ سے ملاقات کرنی چاہئے۔ میرا جسم کسمسا رہا تھا۔ اور مجھے بستر پر پڑے رہنے کی تاکید کر رہا تھا۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، میں خود کو چھوڑ کر تیزی سے اٹھی کمرے سے برآمدے تک کوئی خیال میرے پاس نہیں تھا، برآمدے سے دروازے تک پہنچتے ہوئے مجھے یوں لگا موسیٰ مجھے دیکھنے آیا ہے یہ موسیٰ ہے، یہ موسیٰ ہے۔ میں نے موسیٰ کی رٹ میں دروازہ کھولا۔

''موسیٰ ہو؟''

''نہیں!'' آنے والا آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

''پھر تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' میں آنے والے پر چیخی۔

وہ پیچھے ہٹ گیا اور مجھے پریشان نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے دروازہ زور سے بند کر دیا۔ وہ دروازہ پیٹتا رہا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا جو مجھے اپنی ہی چیخوں میں سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ایک بار پھر موسیٰ کے حصار میں تھی۔ دروازے پر موسیٰ نہیں تھا موسیٰ، موسیٰ،

موسیٰ میں نے نیند میں ہی کمرے کی ہر چیز بکھیر دی۔ اور بے ہوشی کی نیند سو گئی۔ نہ جانے کتنی دیر سوتی رہی۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے یوں لگا جیسے میں ایک طویل سفر کے بعد کسی نئی جگہ پہنچ گئی ہوں۔ رات کی حالت مجھے یاد آئی میں نے سہم کر خود کو آئینے میں دیکھا اور بے اختیار ایک دیوانی ہنسی میرے ہونٹوں سے ابلنے لگی۔ ہنستے ہنستے میں بے حال ہو گئی۔ موسیٰ اکثر جب میرا مذاق اڑاتا تھا تو ایسے ہی بے حال ہو جاتا تھا، جیسے میں آج اپنی رات کی حالت کو یاد کر کے ہنس رہی ہوں۔ میری ہنسی یہ سوچ کر ہی ختم ہو گئی۔ اب میری آنکھوں سے آنسو ابلنے لگے تھے۔ میں نے آئینے میں دیکھا موسیٰ میرے پاس افسردہ کھڑا تھا۔

پانچواں باب

(۱)

یہ وقت کیسے گزر رہا تھا، اگر کسی کے ہاتھ میری کہانی لگے گی تو وہ شاید میری زندگی کے ضائع ہونے کا افسوس کرے۔ ہو سکتا ہے۔ میری داستان کو لوگ لوک ورثہ کا حصہ بنا دیں کہ میں نے اپنی زندگی ایک ایسے سائے کے پیچھے دوڑتے ہوئے گزار دی جس کی جھلک بچپن کے گلی کوچوں میں میری نگاہوں نے جذب کی تھی۔ بہر حال، ابھی تو میں یہ داستان لکھ رہی ہوں اور نہ جانے کب تک لکھتی رہوں گی۔

میرے حصے کا وقت کب اور کہاں ختم ہوگا، ابھی اس کا دور دور پتہ نہیں ہے۔ کون جانے میں اس واہمے کی گردش میں کب تک رہوں گی۔ کب تک میں موسیٰ کی یاد کے ساتھ ساتھ بھاگتی رہوں گی۔ موسیٰ جو مجھ سے بہت دور کہیں پہاڑوں کو توڑ رہا ہوگا اور راستے بنا رہا ہوگا ان کے لیے جو ان اونچائیوں کی طرف جانے کا ارادہ باندھ رہے ہونگے۔ اور ان کو سر کرنے کے خواب دیکھ رہے ہوں گے۔ موسیٰ شاید مجھے بھی یاد کرتا ہو اور جس طرح میں اس سے باتیں کرتی رہتی ہوں وہ بھی کرتا ہو اور جب کسی سنگین محنت میں جتا ہو تو مجھ سے لڑتا بھی ہو جیسے یہ سب میری وجہ سے اس پر بیت رہی ہو۔

(۲)

جب پہلی بار میری ملاقات اس جوان سے ہوئی جو مجھے راہ چلتے مل گیا تھا، اس کی آنکھیں جیسے کچھ کھوج رہی تھیں۔ ان میں اداس رہنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ اس دن میں پیدل اپنے کام سے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ فراٹے بھرتی ہوا میرے منھ پر پڑ رہی تھی۔ ہوا سے سنبھلنے کے لیے میری چال دھیمی تھی۔ وہ تیز قدموں سے میری طرف بڑھا جو شاید پہلے سے میرا پیچھا کر رہا تھا۔

''پیدل کیوں جا رہی ہیں، میں آپ کو چھوڑ دوں؟''

اس نے جھک کر مجھ سے کہا۔ سوال کے تسلسل میں اس نے پوچھا، کہاں جانا ہے؟
وہ سوال کر رہا تھا اور میں اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھی جو اداسی کا مسکن تھیں۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کوئی اس طرح اچانک مجھ سے مخاطب ہوا۔ اور اتنی اپنائیت سے۔

"کہیں نہیں"

"میرے پاس گاڑی ہے اور آج فرصت بھی، میں آپ کو چھوڑ سکتا ہوں جہاں آپ جانا چاہتی ہیں۔"

میں اس کی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی بے پناہ بے چینی میں کھوئی ہوئی تھی جیسے کہیں کچھ زندگی کی بہت اہم چیز کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں۔ میں اس کے بتائے ہوئے راستے پر اب چلنے لگی۔ یہ میری گاڑی ہے یہاں ... وہ اشارے کرتا ہوا مجھے رضامند دیکھ کر اب بہت مستعدی سے میرے آگے آگے راستہ دکھاتا ہوا چل رہا تھا۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا: .. ڈریے گا نہیں، میں بے ضرر آدمی ہوں۔ آپ گھر جا رہی ہیں یا کسی کام سے۔

"کہیں نہیں۔" میں یہ کہتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔

"لیکن کہیں تو جانا ہے۔"

"ہاں کہیں تو جانا ہے" میں نے ایک بار پھر ان آنکھوں کی جانب دیکھا جو مجھے بے چین کر رہی تھیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا وہ مجھے لفٹ نہیں دے رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کی یہ اداسی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ یہ میں نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔ وہ گاڑی چلا رہا تھا اور میں یاد کر رہی تھی۔ میں اس کے سوالوں کے بیچ صرف اپنی یاد داشت کو اندھیروں سے گھسیٹ گھسیٹ کر لا رہی تھی۔ میں آپ کو گھر چھوڑ دوں گا حفاظت سے۔ آپ مجھے گھر کا راستہ بتانے میں مدد کریں۔ کون کون ہے آپ کے ساتھ۔ سوالوں کو اور آگے بڑھاتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔

میں پھر جھول گئی۔ اداسی کی دلدل میں پھنسی وہ آنکھیں۔ کیوں مجھے یاد نہیں آ رہا اس سے پہلے کہاں دیکھی تھیں۔ اب میرے اندر جھنجھلاہٹ پیدا ہو رہی تھی اور ایک شدید الجھن۔ جو چاہتی تھی کہ میں اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اس اداسی کو تلاش کر لوں جو اس سے پہلے کہیں میں نے دیکھی تھی۔ وہ پوچھ رہا تھا میرے گھر کا پتہ اور میں یاد کو دہرانے کی شدت میں ڈوب چکی تھی۔ میں چاہتی تھی وہ مجھ سے بار بار سوال کر کے میری طرف دیکھے تاکہ میں یاد کے اس کنارے پہنچ سکوں جس تک میں پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ کافی دیر گاڑی چل چکی تھی۔

وہ پوچھ رہا تھا، ''کیا تم گھر کا راستہ بھول گئی ہو۔''

اب گاڑی اس نے روک دی تھی۔ میں اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جن میں جھپاکے مارتی اداسی میرے دماغ میں جلتی بجھتی ہیڈ لائٹ کی طرح اندھیرے اجالے کا کھیل کھیل رہی تھیں۔

''اب بتاؤ مجھے، کون سے راستے پر تمھارا گھر ہے۔''

شاید وہ بھی دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی آنکھوں کی طرف ایسے ہی دیکھ رہی تھی جیسے کوئی تنکا ان میں پڑ گیا ہو۔ اور میں خود یوں تھی جیسے کوئی پرانے کپڑوں کے گٹھر میں کسی نئے کپڑے کی دھجی تلاش کر رہی ہوں۔

''کوئی گلی، کوئی سڑک، کوئی نمبر۔''

وہ اب میری حالت سے پریشان ہو رہا تھا۔ میرے چہرے پر سکتہ تھا اور میری آنکھیں اس سکتے میں اس کی آنکھوں کے آس پاس گھوم رہی تھیں۔ شاید میری یہ حرکت اس کے اندر کوئی خوف پیدا کر رہی تھی۔

''تم چاہتی کیا ہو؟'' وہ اب اپنے دل میں اٹھتے ہوئے سوالوں کے بیچ سے پوچھ رہا تھا۔

لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ مجھے کوئی بھی آواز اس اداسی کی بازگشت تک پہنچنے سے

روکے۔ میں نے اس کے سوالوں کا جواب اس طرح دینا چاہا کہ ایک بار اس کو سب بتا دوں اور بیچ میں وہ مجھ کو ڈسٹرب نہ کرے۔ میں نے گھر کا پتہ، اور یہ کہ کون کون میرے ساتھ رہتا ہے سب اس کو ایک تیز اور پھسلتی ہوئی آواز میں بتا دیا۔

کیا؟اس کے سوال اب ایک دوسرے پر چڑھتے پڑ رہے تھے۔ ''تمھارے ساتھ تم، تمھارا آئینہ، اور ایک کونہ جہاں تم اپنی چھوٹی انگلی سے زمین کھودتی ہو۔''

اب وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور میں جلد سے جلد اس کنارے تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اس یاد کے کنارے جہاں مجھے اس کی آنکھوں کی اداسی نے پہنچنے پر آمادہ کیا تھا۔ اور اتنی دیر میں، میں اپنی ناکامی پر کڑھنے لگی تھی۔

اس کے کسی سوال پر میں کہہ رہی تھی، ''ہاں، میں وہاں اکیلی رہتی ہوں۔''

''کیسے ممکن ہے، اس حالت میں تم اکیلی۔ اتنی بڑی دنیا میں تمھارا کوئی نہیں؟''

''نہیں ہے، میں نے تم کو بتایا نہ کہ میرے ساتھ کون کون ہے۔'' اب وہ میری طرف منھ کیے بیٹھا تھا اور میں اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ رہی تھی اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ کیا سوچ رہا تھا اور کیوں میری طرف دیکھ رہا تھا میں نہیں جاننا چاہتی تھی یہ سب میرے لیے رکاوٹ بن سکتے تھے۔ لیکن میرا دل ایک اون کے گولے کی طرح الجھا ہوا تھا جسے میں سلجھانے میں لگی تھی۔ میری یادداشت اتنی بری تو نہیں رہی کہ میں یاد کرنا چاہوں اور کچھ یاد نہ آئے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں وہ سب نہ بھلا دیتی جس کی سزا میں کاٹ رہی ہوں۔ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اور دل مسوس رہی تھی۔ پھر میں یاد ہی کیوں کرنا چاہتی ہوں اس لمحے کو جو اس اداسی سے میل کھاتا ہو۔ کیوں میں اس مخمصے میں دھنسی ہوئی ہوں۔ میں سوچے جا رہی تھی۔ اور وہ میری حالت سے دور شاید اس وقت کو کوس رہا ہو جب اس نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دی تھی۔

''تم کیا دیکھ رہی ہو میری آنکھوں میں، کیا میری آنکھیں اتنی اچھی ہیں کہ میں تم کو ایک ٹک ان کی طرف دیکھتے ہوئے کب سے دیکھ رہا ہوں۔ کیا واقعی میری آنکھیں

اتنی اچھی ہیں۔ ابھی تک تو کسی نے اس طرح مجھے کبھی نہیں دیکھا۔'' اس کے سوالوں نے اب نیا تانا بانا بننا شروع کر دیا تھا۔ اور اس کی آواز اب اس ہوا کی طرح مجھے ایسے پیچھے ڈھکیل رہی تھی جو کسی کاغذ کے ٹکڑے کو اپنے ساتھ آگے کے بجائے پیچھے کی طرف لے جائے جہاں سے وہ ہوا میں ہی رلتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ ہاں شاید اب میں یادوں کی سیڑھیوں پر ہانپتی ہوئی چڑھ رہی تھی۔ جہاں کوئی نہیں تھا، اور وہ پوچھ رہا تھا کیا تم کو بھی میری آنکھوں میں اداسی نظر آتی ہے۔ میں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پلٹ کر دیکھا اور سر ہاں میں ہلایا۔

وہ اب ہنس رہا تھا۔ اس کی ہنسی کی آواز نے مجھے دور بہت دور لے جا کر پٹخا۔ کہیں دور جاتی ہوئی دھول اڑاتی ہوئی سامان سے اور لوگوں سے لدی ہوئی گاڑیاں۔ جن میں سے ایک پر موسیٰ بیٹھا ہوا تھا اور زمین تک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اداسیوں سے لدی تھیں جن میں اتنا بوجھ تھا کہ وہ میری طرف بھی دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ میں ایک چیخ کے ساتھ اس کا نام پوچھ رہی تھی۔ ''کیا نام ہے تمھارا؟'' میں نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔

''تم موسیٰ ہو۔ تم ہی موسیٰ ہو سکتے ہو۔ تمھاری آنکھوں میں اداسی اس اداسی سے ملتی جلتی ہے، جو اس کی آنکھوں میں جب تھی جب وہ مجھے اور اس زمین کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔''

''کس زمین کو، کون تھا موسیٰ۔ خیر وہ جو بھی کر رہا تھا لیکن میں موسیٰ نہیں ہوں۔''

''تم موسیٰ ہو۔'' میں چیخ رہی تھی۔ اتنی دیر تک، میں جس یاد کو بحال کرنے میں لگی تھی اس نے میرا دماغ ایک پھوڑے کی طرح دکھا دیا تھا۔ اب اس میں نہیں سننے کی ہمت نہیں تھی۔ ''تم کیوں نہیں کہتے ہو کہ تم موسیٰ ہو۔''

اب اس کو میرے پاگل پن پر شائبہ نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ مجھے بہلا رہا تھا۔

''ہاں، لوگ کہتے ہیں میری آنکھوں میں ایک ایسی اداسی ہے جیسے کوئی مجھ سے

بچھڑ گیا ہو۔''

'' ہاں، تم سے میں بچھڑ گئی تھی۔تم کو تو یاد ہو گا سب کچھ، میں تم کو یاد نہیں دلاؤں گی۔ یاد کرو وہ وقت جب ہم دونوں ایک ساتھ اس گڑھے کو کھودتے تھے، جس کو کھودنے کے بعد تم نے کہا تھا خزانہ نکلے گا اور تم اس سے ہسپتال بناؤ گے، اور اسکول جہاں وہ بچے پڑھیں گے جو تمھاری طرح پڑھائی سے محروم رہ نہ جائیں۔''

اب وہ آنکھیں پھاڑے جن میں اداسی کے ساتھ ساتھ میرے لیے ترس بھی شامل تھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اور میں اسے یاد دلانے کی پوری کوشش میں گاڑی سے اتر کر چیخ رہی تھی: '' موسیٰ یاد کرو، یاد کرو نا۔''

'' اف! میں تم کو کیسے یقین دلاؤں میں موسیٰ نہیں ہوں۔''

میری حالت چیخ چیخ کر خراب ہو رہی تھی اور وہ مجھے اب ہسپتال لے جانے پر تل گیا تھا۔ وہ مجھ پر رحم کھا رہا تھا اور میں کڑھ رہی تھی یہ کیوں بھول گیا وہ سب۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا چلو، میرے ساتھ اور دیکھو وہ جگہ جس کو تم بھلا بیٹھے ہو۔ وہ شاید پہلے مجھے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا ہو گا لیکن پھر اچانک گاڑی میں بیٹھا اور میری طرف خائف نظروں سے دیکھتا ہوا گاڑی بھگا کر لے گیا میں سڑک پر اکیلی کھڑی موسیٰ موسیٰ پکارتی رہ گئی۔ اور دور تک نہ ختم ہونے والی سڑک پر اس کی گاڑی ایک نقطے میں بدل چکی تھی۔

(۳)

یہ زندگی جس کا آغاز کہاں سے ہوا اور کیا اس کا انجام ہونا ہے شروع سے لے کر زندگی کے اس حصے تک جو میں حال کے تانوں بانوں میں گزار رہی تھی۔ میں کبھی خود کو وقت کے اسکرین پر چلتا دیکھتی ہوں۔ وہ لڑکی جو موسیٰ کے ساتھ ہواؤں اور آوازوں میں رقص کر رہی ہے اور پھر آہستہ آہستہ تبدیل ہوتی ہوئی دوسری جانب ایک خانہ بدوش عورت کی طرح، جو وقت کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں ایک بازگشت کے پیچھے دوڑ

رہی ہے۔ میں نے اپنا گھر اپنا سکون اور تمام سازوسامان صرف اس بازگشت کے حوالے کر دیا۔ بعض دفعہ مجھے یوں لگتا جیسے میں وہ مسافر ہوں جو نامعلوم اسٹیشن پر غلطی سے اتر گیا ہو اور پھر چلتی ہوئی ٹرین کے پیچھے بھاگ رہا ہو۔ زندگی جس آوارگی میں گزر رہی تھی اس کو کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ کوئی سمجھ سکتا تھا۔ میری رشتہ داریاں خاندان لوگ دوست مجھے کسی کا پتہ نہیں تھا بس ایک نام، ایک واہمہ، ایک خواب، جس کے درمیان میرا سفر جاری تھا۔ زندگی کا کتنا حصہ میں نے اسی طرح گزار لیا تھا۔

(۴)

ایک شام جب جھٹپٹے میرے گرد رقص کر رہے تھے، میں پھر آئینے کے سامنے تھی۔ مجھے لگا میں ایک اجنبی عورت کے سامنے کھڑی ہوں، جو سوالیہ نظروں سے مجھے گھور رہی ہے اور مجھ سے پوچھ رہی ہے۔ تم کب تک ان حالوں میں رہو گی، کب خواب کی اس کڑی کو توڑو گی جس کے حصار میں سالہا سال سے گھری ہوئی ہو؟ تمہارے چہرے پر مسافت کی دھول نے دھواں سا پھیر دیا ہے۔ اس خواب سے تمہاری آنکھ کب کھلے گی۔ میں تاسف سے ہاتھ ملنے لگی میرا دل بوجھل ہو کر مجھے مسلنے لگا۔ واقعی میری آنکھیں بجھنے لگیں تھیں اس میں صرف تلاش کی چمک باقی تھی لیکن میں کیا کر سکتی ہوں۔ میری ہوک باقی تھی، میرے اندر موسیٰ سے ملنے کی ہُوک آج بھی جوں کی توں تھی لیکن یہ عورت مجھے دور سے دیکھ رہی ہے اور رو رہی تھی میری حالت پر اور میرے لمحوں کو وقت کے پانی میں گھلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

شام گھٹ کر رات میں داخل ہو رہی تھی۔ میری افسردگی جوں کی توں ٹھہری ہوئی تھی۔ ملال اور ہڑک کے درمیان اضمحلال قطرہ قطرہ میرے دل میں اتر رہا تھا کہ اچانک گلی میں مجھے شور سنائی دیا۔ بہت سی آوازیں چھوٹے بڑے بچوں کی جو ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے اپنے کسی کھیل کی بربادی پر ایک دوسرے پر آوازیں کس رہے تھے۔ میں

نے دوڑ کر کھڑکی کھول دی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کے ساتھ وہ آوازیں بھی میرے قریب ہو گئیں اور وہ چھوٹے بڑے قدوں کے ساتھ وہ چہرے بھی۔ میں ایک ایک کے چہرے کو اس اندھیرے میں ٹٹولنے لگیں۔ ایک، دو، تین، چار میری آنکھیں کیمرے کی طرح ان کے نقوش ڈھونڈھ رہی تھیں اور جذب کر رہی تھیں نہ جانے کب تک میں یہ کرتی رہی۔ وہ آوازیں کب غائب ہو گئیں، کب وہ چھوٹے بڑے قد اس اندھیرے سے نکل گئے۔ مجھے پتہ نہیں چلا میں تو ان آوازوں میں اس آواز سے ملتی جلتی آواز سننا چاہتی تھی جو موسیٰ کی تھی۔ پھر اس آواز کے پیچھے دوڑتی ہوئی میں، وہاں کہاں تھی۔ میری آنکھیں دھندلانے لگیں۔ میں نے قلا بازیاں کھاتے ہوئے سناٹے سے بچنے کے لیے کھڑکی بند کر دی جو ہنستا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔

(۵)

مجھے نہیں معلوم زندگی کے یہ فیصلے اور ان میں پھیلے ہوئے دکھ، وہ لوگ جو میری کہانی پڑھ سکیں گے کتنا سمجھ پائیں گے۔ شاید وہ مجھے پاگل قرار دیں لیکن یہ سب کچھ ایسے ہی ہو رہا تھا اور اس کی سزا میرے چاروں طرف اجنبیت اور بے گانگی کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سزا میں سالہا سال سے کاٹ رہی تھی۔ ہر دن میرے لیے ایک نئے احساس اور خوف کے ساتھ نمودار ہوتا جو میری گردش میں اضافہ کر کے چلا جاتا۔ لیکن میرا تجسس اور پکار مجھے اس خوف میں ہی راستہ بنانے پر مجبور کرتا، یہ نامعلوم بندھن جو اس تلاش کے ساتھ میری رگ رگ میں اتر گیا تھا۔ اور جو مجھے بے سمتی کے تیز رفتار ہنگامے کی طرف دھکیل دیتا تھا۔

یہ سچ ہے کہ میں بے یار و مددگار طویل راتیں اور طویل دن گزارتے گزارتے تھک بھی رہی تھی لیکن تلاش کی دیوانگی مجھے بے سر و سامانی کی طرف کھینچ رہی تھی اب میرے گزر اوقات کا بھی کوئی ذریعہ نہیں باقی بچا تھا، میں اب اس قابل نہیں رہی تھی کہ

فائلوں میں سر کھپا سکوں۔ سر چھپانے کے لیے بس ایک گھر تھا جو اماں ابا میرے لیے چھوڑ گئے تھے۔ میری تھکن اور اکتاہٹ نے آخر یہ فیصلہ کیا کہ میں اس شہر کو چھوڑ دوں میں نے اپنا تمام سامان بیچ دیا اور سفر اختیار کیا۔

جانے سے پہلے میں آخری بار اس گڑھے کی طرف گئی جسے ریت نے پاٹ دیا تھا اور جس کے چاروں طرف صرف قدموں کے نشان پھیلے ہوئے تھے مجھے اس گڑھے کو ڈھونڈنے میں دقت ہو رہی تھی۔ لیکن میں نے ڈھونڈھ نکالا۔ وہ گہرائی کی انگلی بھر بساط بھی نہیں رکھتا تھا۔ جبکہ میری تمام انگلیاں ضائع ہو چکی تھیں۔ میں نے آخری نگاہ اس پر ایسے ڈالی جیسے کسی بڑے قرض سے نگاہ چُرا رہی ہوں۔

میں نے کیسے اور کہاں جانے کا فیصلہ کیا مجھے اب کچھ یاد نہیں سوائے اسکے کہ ہوش کی اس منزل پر میں نے آنکھ کھولی جب مجھے بے حد بھوک لگی تھی۔ میں بھوکی تھی، پیاس بھی مجھے حلق تک زخمی کر رہی تھی۔ میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا میرے سامنے ایک شخص کٹورے سے منھ لگائے ایک عجیب آواز میں پانی پی رہا تھا۔ میں نے اس آواز کے دوران ہی اس سے پانی مانگا۔ شاید پیاس میری آنکھوں میں بھی اتر گئی تھی۔ اس نے رحم کی نگاہ سے مجھے دیکھا اور اپنے برتن سے پانی نکال کر میری طرف بڑھایا، میں نے ایک ہی سانس میں کٹورا خالی کر دیا ایک بار پھر کٹورا اس کے سامنے کر دیا۔ وہ مسکرایا اس نے دوسری بار بھی کٹورا بھر کر میرے سامنے کر دیا۔ پانی پی کر میری بھوک جاگ اٹھی۔ میں نے سفر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں رکھا تھا، مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ ٹرین مخصوص آواز کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ ''میرے پاس کچھ بچا ہوا ہے کھا لو۔'' اس نے ایک روٹی پر کچھ سالن رکھ کر مجھے دے دیا۔ میں نے بھوک کی آفت سے نکلنے کے لیے جلدی جلدی نوالے حلق سے اتارنا شروع کر دئے۔ اس دوران شاید حیرت اور مسرت سے وہ مجھے دیکھتا رہا۔ گویا میں ایک ننھی سی بچی ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ایک شفقت بھی مجھے نظر آئی۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہاں جا رہی ہو۔''

میں نے آخری نوالہ حلق سے اتارا۔

''کسی بھی اسٹیشن پر اتر جاؤں گی۔''

''کیا؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے ابلنے لگیں۔ کیا خفا ہو کر جا رہی ہو گھر والوں سے۔''

''نہیں۔''

''گھر والوں سے روٹھ کر جا رہی ہو؟''

''گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے، بس میں ہوں۔''

''تم اکیلی ہو۔''

''ہاں۔'' میں اب باہر کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں منظر گھبرائے ہوئے لوگوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔

''شاید۔''

اس بار وہ ہنس پڑا۔ میں نے اس کے چہرے کو پہلی بار غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ ایک ایسی کتاب کی طرح لگا جس کے لفظ سمجھ میں نہ آنے کے باوجود آشنا سے لگتے ہیں۔ وہ درمیانی عمر کے حصے میں تھا۔ تمام راستے وہ میری حرکات وسکنات پر نظر رکھتا رہا اور جب ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو اس نے اپنا سامان جلدی جلدی سمیٹا اور تیزی سے میرا ہاتھ تھام کر تقریباً مجھے گھسیٹتا ہوا باہر آیا۔ میں حیرانی اور سکتے کے عالم میں اس کے اس عمل پر احتجاج بھی نہیں کر سکی۔ اس کا احسان مجھ پر تھا۔ اسٹیشن پر رات جتنے والی تھی، اکا دکا نیلے والے چہروں پر اطمینان لیے کھڑے تھے گاڑی کانوں کو ناگوار آواز پیدا کرتی ہوئی نکل گئی تھی۔

''تم کون ہو، یہ کون سا اسٹیشن ہے۔''

''ارے بھئی تم کو اس چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بے تکلف آواز

میں بولا۔

نہ جانے وہ مجھے کیا سمجھ رہا تھا۔ تیز ٹھنڈ اور تنہائی اور نامعلوم خوف سے میری گھگھی سی بندھی جا رہی تھی۔ اس نے بستر کھول کر ایک چادر مجھے اڑھا دی۔

''اب میرے ساتھ چلو، اور کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

میں اس کے پیچھے بے سدھ چلنے لگی۔ آج پہلی بار مجھے اپنی اس آوارہ زندگی پر اور اپنے فیصلوں پر افسوس ہو رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنے عورت ہونے کا احساس پہلی بار مجھے ندامت اور دکھ سے دوچار کر رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے گرتی پڑتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے قدم تیز اور کبھی سست پڑ رہے تھے۔ رات اندھیری ہوتی جا رہی تھی۔ یہ شاید کوئی گاؤں تھا۔ جوں جوں آگے کی طرف راستہ جا رہا تھا کچے پکے مکان ذرا فاصلے سے نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک پگڈنڈی سی تھی جس پر وہ مجھے لے جا رہا تھا۔ اس بے خانماں حالت میں میں نے خود کو موسیٰ کی یاد سے چمٹا لینا چاہا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ خوف میرے جسم میں نشتر کی طرح چبھ رہا تھا۔ میں مدد کے لیے بھی کسی کو پکار نہیں سکتی تھی۔ پھر مجھے اس نے اونچی اونچی دیواروں والے ایک گھر کے سامنے لا کھڑا کیا۔ چاروں طرف مویشی اپنا منھ اندھیرے میں چھپائے کھڑے تھے دروازہ کھلنے کی آواز پر میں نے اس اندھیرے سے آنکھیں ہٹائیں۔ جس میں جانوروں کے پیشاب، پخانے کی بو بھی بسی ہوئی تھی۔ دروازہ اس طرح کھولا گیا جیسے کھولنے والے کو معلوم ہو کہ کون آیا ہے روشنی کی ایک لکیر باہر آ کر گری۔

''آ جاؤ۔'' وہ دروازہ کھولنے والے سے کچھ کہے بغیر مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں پیچھے پیچھے اس طرح چل دی جیسے وہ مقناطیس ہو اور میں اس سے چپکنے والی کوئی دھات۔ راستے میں برآمدے اور ان میں پڑی ہوئی اونچی اونچی چارپائیاں جن پر کچھ عورتیں اور بچے لیٹے ہوئے تھے عورتیں اس کی آواز سن کر اپنی اپنی چارپائیوں سے اٹھ گئیں۔ وہ بغیر کسی سے کچھ کہے اور کسی کی طرف دیکھے مجھے ایک بڑے ہال نما کمرے

میں لے گیا جہاں بہت خوبصورتی سے کمرے میں ہر چیز رکھی ہوئی تھی۔

''یہاں ٹھہرو۔''

اس کی آواز نرم اور مشفقانہ تھی۔ میں سرعت سے کرسی پر گر گئی۔ وہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد بہت سی عورتیں وہاں قطار میں آ کر وہاں کھڑی ہو گئیں۔ اور مجھے اس طرح دیکھنے لگیں جیسے کوئی نیا پرندہ کسی پنجرے میں لا کر رکھا گیا ہو۔ میں نے کسی کے چہرے پر کوئی ناگواری نہیں پائی ،گویا ان کے لیے ہوتا آیا ہو۔ وہ دیر تک مجھ کو اس طرح دیکھتی رہیں انھوں نے آپس میں بھی کوئی بات نہیں کی ایسے جیسے ان کے کسی کے منھ میں زبان ہی نہ ہو۔ میں نے بھی اپنی تھکن اور بدمزہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ان کو صرف خود کو دیکھنے پر ہی چھوڑ دیا۔ پھر وہ سب ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئیں۔ اس شخص نے ان عورتوں سے میرا کیا کہہ کر تعارف کرایا مجھے نہیں پتہ چلا ،لیکن اس رات سے لے کر صبح تک شاید وہ سب جاگتے رہے اور میری آؤ بھگت میں لگے رہے۔ میں اس خدمت پر پشیمان اور حیران تھی۔ صبح کے اجالے میں اس نیند سے جو میں جاگتے میں کاٹ رہی تھی جب اٹھی تو سب پھر تیزی سے میری خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ اور اس شخص کے اشاروں پر میری تواضع کی جارہی تھی۔

میں کمرے سے باہر آ گئی۔ چوڑے شفاف صحن اور طویل طویل برآمدوں کے درمیان انتہائی نفاست سے بستر بچھے ہوئے ،کرسیاں اور مٹی کے گھڑے جن پر نقش کاری نے ان کو خوبصورت بنایا ہوا تھا۔ جن میں ایک عورت گاہے گاہے پانی بھر دیتی تھی۔ کئی بچے بہت مستعدی سے صاف ستھرے کپڑوں میں کہیں جا رہے تھے۔ مجھے باہر آتا دیکھ کر ایک عورت نے انتہائی فرماں برداری سے ایک کرسی پیش کی جس پر بیٹھتے ہوئے میں نے اس کی طرف تشکر کی نظروں سے دیکھا ،لیکن وہ اس وقت کسی دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

اس دوران انھوں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا ،سوائے میرے آرام وسکون کے انھوں نے کوئی سوال نہیں کیا۔

جب دن چڑھ گیا تو پہلی بار میں نے اس شخص کو دن کی روشنی میں غور سے دیکھا۔ اس کی جلد کا بادامی رنگ اس کی آنکھوں کے رنگ سے مل کر کسی درخت کی چھال کا احساس پیدا کر رہا تھا۔ اس کی آواز اور آنکھیں میرے گرد ایسے گھوم رہی تھیں گویا میں ایک ننھی بچی ہوں جو اپنا گھر بھول کر ادھر آ نکلی ہوں۔

اب اس ماحول سے میری اجنبیت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی جو میرے اندر گھٹن پیدا کر دینے والا خوف پیدا کر رہی تھی۔ میرے کئی دن اور کئی راتیں اسی طرح اس شخص کی نرم اور ملائم آواز کے درمیان اور اس گھر کی عورتوں کی تواضع دیکھتے ہوئے گزر گئیں۔ اب میرا خوف معدوم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اکتاہٹ اور بے چینی جاگ رہی تھی۔ اس ماحول کی وضع قطع پہلے سے طے شدہ ہو۔ جو ہو رہا ہے وہ ایک سینری کی طرح تھا۔ ایک لینڈ اسکیپ جیسا۔ ہر چیز موجود تھی لیکن متحرک نظر نہیں تھی۔ آوازوں کے درمیان بھی خاموشی کا ڈیرا تھا۔ عورتیں اس طرح نظر آتیں تھیں جیسے پہلے سے ہر کام کے لیے ان کو ریہرسل کرائی گئی ہو۔ میں نے ان میں سے کسی سے بات کرنا چاہی لیکن ایک خوش نودی سے لبریز مسکراہٹ سے مجھے نواز دیا جاتا تھا میری اکتاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ایک ایسی کسل مندی میرے جسم پر پھیل رہی تھی جو مجھے صرف بے زاری سے جوڑ رہی تھی۔ جس دوران وہ عورتیں ایک ساتھ بیٹھ کر باتیں کر رہی ہوتیں وہ مجھ سے اتنی بے گانہ سی ہوتیں گویا میں ان کے درمیان ہوں ہی نہیں۔ میں پرانے نقش و نگار کا کوئی صوفہ یا دیوار پر لگے ہوئے جنگ میں استعمال ہونے والے اوزاروں میں سے کوئی ایک ہوں۔ اس گھر میں اگر کوئی میرے پاس آتا تھا تو وہ ننھا بکری کا بچہ جس کو مویشیوں کے باڑے سے شاید اندر آنے کی اجازت تھی۔ میں جب کمرے سے باہر آتی تھی تو وہ اچھل اچھل کر مجھے اپنے کرتب دکھاتا۔ اور میری اکتاہٹ جو اکثر بڑی بڑی جماہی میں بدل بدل جاتی تھی، کم کر دیتا تھا۔ مجھے اس سے انسیت بھی ہو چلی تھی۔ اب وہ ہی میری توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہ بھی شاید جان چکا تھا کہ اسے میرا دل کس طرح بہلانا ہے۔ جب میں اس سے

کھیل رہی ہوتی، تو ایسے وقت وہاں موجود بچے اس میں شامل نہیں ہوتے۔ شروع شروع میں مجھے حیرت بھی ہوئی، بچے اس کھیل میں شریک کیوں نہیں ہوتے۔ لیکن پھر ماحول کی پراسراریت نے مجھے خاموش رہنے دیا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا جیسے میں ہر زمانے سے کٹ گئی ہوں۔ اور وقت نے مجھے بہلانے کے لیے یہاں لا پہنچا ہے۔ لیکن یہ سب جو ہو رہا تھا تمام تر بے زاری اور اکتاہٹ کے باوجود بہت غیر مانوس سے اس جزیرے کی طرح تھا جو اپنے مناظر سے میری دلجوئی میں لگا ہوا تھا۔

ایک دن بکری کے بچے کی غیر موجودگی میں، میں نے ایک بچے سے جو مجھ سے بے نیاز اپنے اس کھلونے سے کھیل رہا تھا جو کالاشنکوف کی شکل میں بنی تھی، پوچھا آج وہ آیا نہیں، کہاں ہے، تو جواب دینے کے بجائے وہ بارچی خانے کی طرف اشارہ کرنے لگا، جہاں سے چاولوں کے پکنے کی انتہائی عمدہ خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں پہلے سمجھی نہیں۔ لیکن کھانے کے برتن جب میرے سامنے رکھے گئے تب مجھے کھانا لانے والی بتایا نے کہ آج میری کس گوشت سے تواضع کی جا رہی ہے۔ میری بھوک اس لمحے ہی سمٹ گئی۔ میں خاموشی سے کھانے کو تکنے گئی۔ ایک لقمہ بھی میرے حلق سے نہیں اترا۔ میں نے پانی پی کر اس وقت کی سفاک دعوت کو رد کر دیا تھا۔

ایک صبح میں نے اس شخص کو سامنے سے آتے دیکھ کر کہا ''مجھے جانا ہے۔''

میں باہر صحن میں پھیلی دھوپ میں بیٹھی تھی۔ جو برآمدے سے ہٹ کر کنارے کنارے لگے اونچے درختوں سے اتر کر ابھی ابھی آئی تھی۔

''کیا کوئی تکلیف ہے؟''

''نہیں، لیکن میں اب زیادہ یہاں نہیں رہ سکتی۔''

میں اسے کیا بتاتی کہ موسیٰ کی یاد بھی اب یہاں سسک کر آتی ہے جو میرا واحد سہارا تھی۔

''مطلب یہ کہ گھر بار چھوڑ کر نکلی ہو اور در بدر کی ٹھوکریں کھانا چاہتی ہو۔'' اس کی

آواز میں اس بار نرمی کی کمی تھی۔ میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا تھا۔ اگر تم چاہو تو مجھ سے شادی کرلو۔ یہ عورتیں میری بیویاں ہیں ان کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

اس کا یہ فیصلہ جو وہ میرے بارے میں کر رہا تھا، یا کر چکا تھا مجھے اچنبھے میں ڈال رہا تھا۔ میرے پاس مہلت نہیں تھی کہ میں اس کی بات کا جواب سوچ کر دوں۔ میری زبان نے لفظوں کو میرے دماغ سے نکال کر چابک دستی سے باہر پھینکا: ''لیکن میں شادی شدہ ہوں۔ میرا شوہر ہے۔''

''کیا؟'' اب، وہ پھٹ پڑا۔

''ہاں۔'' میں اپنے دماغ کی اس اختراع پر حیران تھی۔

''کہاں ہے تمھارا شوہر۔''

''پتہ نہیں، وہ کہیں چلا گیا مجھے چھوڑ کر۔''

''کتنا عرصہ ہوا۔''

بہت، میں نے اس بہت کو ماضی کے کس حصے میں پیوست کیا، مجھے خود نہیں پتہ چلا۔

وہ میری اس بہت کی تان پر منھ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''دیکھو تم یہاں رہو۔ میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔ میرا ایک دوست اخبار میں ہے میں گمشدگی کا اشتہار دے دیتا ہوں، تمھیں وہ لینے یہاں آ جائے گا۔ تم اس کا نام لکھوا دینا اور کوئی تصویر ہو تو۔''

میں اپنے ہی گرد جھوٹ اور غیر یقینی احساس میں گھری ہوئی نڈھال ہو رہی تھی مجھے ایسا لگا جیسے بہت اوپر سے کسی نے مجھے نیچے پھینک دیا ہو لیکن میرے پاس اس کے اس فیصلے سے بچنے کے لیے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

''وہ واپس آئے گا؟''

''ہوسکتا ہے۔'' میں نے دل کی آنکھیں میچ کر کہا۔

''تم کو یقین ہے۔''

''ہاں۔''

''کیا تم اس کو ہی ڈھونڈنے نکلیں تھیں؟''

''ہاں۔'' مجھے اس کی واپسی کا انتظار تھا۔ آخر تنگ آکر میں اسے ڈھونڈنے نکل پڑی۔

''کیا نام ہے اس کا؟''

''نام؟ نام؟'' میں ہکلائی۔ پہلی بار یہ جھوٹ میرے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔

''نام بھی بھول گئیں، اتنا وقت گزر گیا؟''

میں نے خاموشی سے کام لیا۔ اور اپنی پریشانی کو اوڑھ کر چپ چاپ بیٹھی رہی۔

حالات اب میرے لیے سنگین ہو چلے تھے۔ اس ماحول میں اب ایک کشمکش کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اور میرا وہاں رکنا اب میرے لیے کوئی نیا دروازہ کھول سکتا تھا جو مجھے کسی اندھیرے کی بھیڑ میں گھسیٹ لے جاتا۔

آخر ایک دن، میں ان عورتوں، بچوں، مویشیوں کے باڑے کی ملی جلی خوشبوؤں سے بھاگ نکلی۔ اس شخص کی غیر موجودگی میں میں نے مویشیوں کی دیکھ بھال کرنے والے ایک شخص سے باہر نکلنے کا راستہ معلوم کیا اور ان عورتوں سے کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے نکل پڑی۔ ایک راستہ جو نامعلوم سمت کی طرف جاتا تھا لیکن مجھے اسی راستے پر چلنا تھا اور کوئی راستہ تھا بھی نہیں۔

وہ چمک دار روشن دن تھا۔ دھوپ بھی قرینے سے چمک رہی تھی۔ راستہ جہاں خاتمے پر آیا، وہاں مجھے کچھ بسیں کھڑی نظر آئیں، ان میں سے ایک بس میں، میں نے خود کو تقریباً پھینک دیا۔ تمام راستے مجھ میں یہ احساس جاگ رہا تھا کہ میں ایک عورت ہوں۔ اور اس بے سروسامانی میں موسیٰ کا خیال اس کا تصور اور اس کی تلاش میرے لیے اب جان جوکھوں کا کام بنتی جا رہی تھی اپنی اس ناگفتہ بہ حالت پر اب کڑھنے کے علاوہ کچھ نہیں بچا تھا۔ اب رہ رہ کر اماں ابا کا چہرہ میرے سامنے گھوم رہا تھا جو تاسف سے مجھے

دیکھتے نظر آتے تھے۔ آوارگی اور بے خانماں ہونے کا دکھ مجھے نچوڑ رہا تھا۔ ایک بار پھر واپسی کا راستہ اور صرف واپسی کا راستہ ہی میرے بس میں تھا۔ میرے قدم اپنے گھر کی طرف مجھے لے جا رہے تھے۔ بس سے اتر کر اسٹیشن پہنچی، کب میں نے یہ سفر طے کیا اور کیسے میں گھر آئی مجھے نہیں معلوم۔

بس یہ رنج مجھے کھائے جا رہا تھا کہ شاید میں اب موسیٰ کی تلاش کی کوئی راہ نہیں ہے۔ میں ایک عورت ہوں اور ہر راستہ مجھے گھاٹے کی طرف لے جا رہا ہے۔

(۶)

میں نے اس ابتر حالت میں جب اپنے گھر میں قدم رکھا تو مجھے یوں لگا جیسے تیز بارش ہو رہی ہے اور ٹھنڈے پانی کی بوندیں مجھے سفر کی کثافت سے نجات دلا رہی ہیں میں ایک بار پھر آئینے کے سامنے کھڑی تھی میرا چہرہ تپی ہوئی زمین کی طرح جل رہا تھا اور میری آنکھیں ناکامی کے احساس سے زخمی تھیں۔ یہ میرا آئینہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ میں نے دیکھا موسیٰ میرے پیچھے کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا، اس کی مسکراہٹ بھی شکست خوردہ زخمی سپاہی کی طرح تھی۔

(۷)

اس گھر میں وہی در و دیوار تھے وہی شام کے سائے اور جھٹپٹے اور ان کے ارد گرد ہانپتی ہوئی میری تنہائی۔ مجھے اندازہ تھا، زندگی جتنی بھی دشوار تھی اس کی ذمہ دار خود میں تھی شروع سے لے کر اب تک میں نے زندگی کو ایک بھیانک خواب کی شکل میں ڈھالا تھا۔ میرا کسی دن سے اور کسی رات پر کوئی اختیار نہیں بچا تھا۔ میرا حال ان کتابوں کی طرح ہو

گیا تھا جو کسی بھی کتب خانے میں برسہا برس سے اندھیرے کونوں میں پڑی ہیں، گمنام جن کو پڑھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن اس احساس کے باوجود میرا دل ایک ایسی طمانیت میں رہتا ہے جیسے پانی کی سطح کے نیچے، نہ نظر آنے والی ایک اور لہر بھی ہلکورے لیتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔ میری کہانی پڑھنے والے ہو سکتا ہے میری ضائع شدہ زندگی پر کڑھیں لیکن میں اس خیال کی دھن میں جو بھی دکھ اٹھا رہی ہوں وہ مجھے نامعلوم لذّت کی طرف لے جاتا ہے جس میں میں گم تھی اور گم ہی رہنا چاہتی تھی۔

اب کچھ دنوں سے میری معاش اور گزر اوقات اس کا کوئی حل سوائے اس کے نہیں تھا کہ میں خود کو باہر کی دنیا میں بھی شامل کروں۔ ابتدا میں میرا ذریعے معاش ابا کی چھوڑی ہوئی تھوڑی بہت پونجی اور وہ سروس جو میں ایک دفتر میں فائیلوں سے سر کھپا کر چلا رہی تھی لیکن جس ڈھچر پر زندگی چل رہی تھی اس میں میں مفلوج ہوتی جا رہی تھی۔ میرے ارد گرد غیر مانوس اجنبیت کا حصار کھینچا ہوا تھا۔ معاشی تگ و دو بھی میرے لیے ناگزیر بنتی جا رہی تھی۔

(۸)

بالآخر مجھے ایک ایئر لائن میں ایئر ہوسٹس کی نوکری مل گئی۔ شروع شروع میں میری یہ زندگی اگرچہ کہ پچھلی زندگی سے زیادہ مختلف نہیں تھی لیکن بہر حال نئی تھی۔ میری تنہائی اور یاسیت کا خول اس نئی جاب نے آہستہ آہستہ توڑنا شروع کر دیا تھا۔ نت نئے لوگ، نئے نئے سفر، زندگی گزارنے کا حوصلہ مجھ میں پیدا ہو رہا تھا اور ایک یہ احساس کہ اب اسی میں رہنا ہے۔ موسیٰ کی یاد اور اس کا خیال میری مصروفیت اور زندگی کے اس پڑاؤ میں معدوم تو نہیں ہوا تھا لیکن وہ مجھے دیمک کی طرح کھانے سے بچا رہا تھا۔ مجھے اتنی مہلت مل گئی تھی کہ میں اپنے چاروں طرف دیکھ سکوں۔ شاید یہ میری وہ مجبوری تھی جس میں مجھے زندہ رہنے کے لیے ایک وقت کی روٹی بھی درکار تھی۔ پھر بھی ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں اس

کسک سے مکمل طور پر باہر آ جاتی۔ اور دنیا کو اس ڈھنگ سے دیکھتی جس ڈھنگ سے تمام لوگ دیکھ رہے تھے۔ لیکن روز بروز بڑھتی ہوئی جاب کے سلسلے کی مصروفیت اور اس میں ہی لوگوں سے ملنا اور شناسائی کا آہستہ آہستہ پھیلتا ہوا دائرہ، میرے لیے جہاں پیدا کر رہا تھا وہاں مجھے یہ بھی احساس دلا رہا تھا جیسے میں ایک سرنگ سے گزر رہی تھی۔ اور اب میرے سامنے کھلا اور دور تک آگے جانے والا راستہ ہے اگر چہ کہ اس کی سمت کا کوئی تعین میں نہیں کر سکی تھی۔

(۹)

کبھی کبھی کوئی خیال ان ہونی کی طرح ماضی سے اس طرح جھانک لیتا جو دیر تک میرے دل کو زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے پر آمادہ رکھتا۔ لیکن میں اس خیال کو جلدی ہی جھٹک دیتی۔ نئی زندگی نے مجھے خوش آمدید کہا تھا۔ تجربے اب نئی نئی شکلوں میں میرے سامنے تھے۔ میرے ملنے جلنے والوں کا دائرہ بڑھتا جا رہا تھا۔

اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان لوگوں کی بھیڑ میں بیچ میں خود کو جیسے چھپا لینا چاہتی تھی۔ طرح طرح کے لوگ مجھ سے ملتے۔ مجھے اور میری وضع قطع کو ایک ایک لمحہ داد کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا تھا۔ مجھے زندگی کے اس رخ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ ان دوستوں کی زندگی سے کوئی رغبت پیدا ہوتی جو میرے ارد گرد میرے ساتھ رہتے۔ انھیں میں یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ کس مہم کو سر کرنے میں اتنی زندگی بتا آئی ہوں۔ سوائے اس کے کہ میں ان کو یہ بتاؤں کہ میں کیسے جی رہی ہوں۔ کیسے سجا جا سکتا ہے کیسے لوگوں پر اس حالت میں برتری حاصل کی جا سکتی ہے کہ میرے پاس کیا کیا ہے۔ میں اس دنیا میں پہنچ کر بھی حیران تھی تمام چمک دمک کے باوجود یہ دنیا میری دنیا سے مختلف اور میرے لیے پریشان کن تھی ہر طرف ایک آپا دھاپی تھی لیکن یہ سب اب میرے لیے ناگزیر تھا مجھے زندہ رہنے کے لیے ایسے ماحول میں خود کو کھپانا تھا۔ جو موسیٰ کی دنیا سے یکسر الگ تھی۔

میں نے ابا اماں کے گھر کو خیر باد کیا، آخری لمحوں میں تالا ڈالتے ہوئے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں موسیٰ کو اس مکان میں بند کر کے جا رہی ہوں، کبھی نہ کھولنے کے لیے، تاکہ وہ میرا پیچھا نہ کرے۔ اب میں نئی زندگی کے سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔ یہ شور اور چندھیا دینے والی روشنی کی دنیا آہستہ آہستہ میرے پرانے زخموں پر پھاہے کا کام کر رہی تھی، مجھے یقین ہو رہا تھا کہ میں موسیٰ کو بھول رہی ہوں۔ اب میں کسی دوستی کسی چہرے کسی آواز میں موسیٰ کا دھوکا نہیں کھاتی تھی۔ میرا حال مجھے عزیز تھا۔ شاید میں موسیٰ کو شکست بھی دینا چاہتی تھی، اس طرح بھول کر۔ ایک دن میری روم میٹ نے مجھ سے کہا تھا تم اپنی فیملی میں نہیں جاتی ہو تمھارا کوئی رشتے دار نہیں ہے اور کوئی عزیز۔

نہیں۔ شاید نہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ میں اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کو بہت پہلے کہیں پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ موسیٰ نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا تھا، حتیٰ کہ مجھے بھی۔ یہ رقص کرتی ہوئی زندگی روشنیوں اور توانائیوں سے بظاہر لبریز یہ سب کچھ مجھ سے دور ہو گیا تھا۔ بلکہ شاید میں ان کے بارے میں جانتی بھی نہیں تھی کہ ایک زندگی ایسی بھی ہوتی ہے۔ میں نے یاسیت کو جھٹک کر اپنی روم میٹ کو دیکھا۔

''حد ہوتی ہے، ایسے کیسے زندگی گزاری ہے تم نے؟ اور اور کب تک گزارو گی؟''

''پتہ نہیں، پتہ نہیں میں نے کیسے اتنا لمبا سفر طے کر لیا۔''

''کیا کوئی مس ہیپ؟''

نہیں کوئی نہیں، میں نے اپنے دل میں جھانک کر کہا۔ اور اچانک حیران ہو گئی۔ واقعی، کیسے ہوا۔ خیر اب میں وہ زندگی یکسر چھوڑ چکی ہوں۔ یہ میرے دوست نت نئی زندگی کی خوشیوں کا ٹھکانہ بتاتے جا رہے تھے۔ اور میں ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک شور سے دوسرے شور میں جلدی جلدی تیز رفتاری سے داخل ہو رہی تھی۔ اس تیز رفتار سفر نے مجھے ایک لمحے بھی رک کر خود سے کچھ پوچھنے نہیں دیا۔ موسیٰ کا خیال اور اس کی یاد زندگی کی اس گہما گہمی میں موسیٰ ہی کی طرح کھو گیا تھا، میری دلچسپیاں اب رقص و موسیقی اور زندگی کے

نت نئے زاویوں میں پھیل رہی تھیں۔ ملازمت کے دوران نئے نئے سفر، ایک ایسا سلسلہ تھا جو مجھے آسمان اور زمین کی بابت بتا رہا تھا یہ الگ بات تھی کہ میں اپنی تنہائی میں وہیں کھڑی تھی اس میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اس کے باوجود کہ بہت سے لوگ میری دلداہی میں پیش پیش رہتے اور اداسی کے بے ہنگم دکھ کو پلٹ کر دیکھنے کی فرصت بھی نہیں دیتے۔ لیکن وہ یہ جان گئے ہوتے میرے ساتھ تھوڑا وقت بھی گزار کر کہ میں ان کے قبیلے کی نہیں ہوں۔

ان میں سے بہت یہ کہتے نظر آتے کہ بھول جاؤ جو تمھارے ساتھ ہوا ہے۔ وہ سمجھتے کہ ابھی ابھی کوئی تازہ واردات میری زندگی میں رونما ہوئی ہے۔ اور اداسی کے ملبے میں دھنسی میں اس سے باہر نہیں آ پا رہی ہوں۔ وقت گزارنے کے لیے بہت سے ہاتھ مصافے کے لیے بڑھے میں نے ان کو تھام بھی لیا۔ لیکن میں خود اس لباس کی طرح تھی جو کہیں سے جل گیا ہو اور اس میں جلی ہوئی بو موجود ہو۔ جو دن گزرتا تھا وہ بظاہر بہت اچھا ہی ہوتا تھا جو مجھے سانس لینے کی فرصت بھی نہیں لینے دیتا۔ لیکن اچانک تنہائی کی بساندھ کہیں سے میرے نتھنوں میں گھس آتی اور دیر تک مجھے پرانے دکھ میں کلبلانے پر مجبور کرتی۔

اگرچہ کہ میں نے اب ازخود زندگی کو اپنی مٹھی میں لے لیا تھا، میں نے اپنی راتوں کو گھر کی چہار دیواری میں گزارنا چھوڑ دیا تھا۔ میری ڈیوٹی بھی مجھے نئے نئے ملکوں اور شہروں میں نئے نئے چہروں میں گم رکھتی تھی۔ دوستی اور محبت کا جواب بھی میں والہانہ انداز میں ہی دیتی تھی۔ لیکن جس کے بعد میں دیر تک خود کو ڈھونڈھنے میں لگی رہتی۔ یہ بھی اب اکثر ہونے لگا تھا۔

اپنی نوکری کے طویل عرصے میں میں ایک دنیا طے کر چکی تھی۔ بہت سے زمانے میں گھومتے ہوئے لوگوں کو اور ان کی زندگیوں کو کھوجتے ہوئے۔ اپنی تنہائی کے ایک ایک گوشے میں بھی میں نے شور اور آوازوں کو بسا دیا تھا۔ انتہائی تحمل اور اس ہی عام رویے

کے ساتھ جس کے ساتھ سب لوگ زندہ رہتے ہیں۔ اور خوش رہتے ہیں یا ہوسکتا ہے وہ بھی ایک ڈھونگ بھری زندگی گزار رہے ہوں، تھک ہار کر وہ بھی اپنی سمتوں کو موڑ چکے ہوں۔

میرا ایک گھر تھا جہاں خوشیوں کے لیے میں نے اپنے گھر کے دروازے کھول دیے تھے کہ وہ آئیں اور جشن منائیں کوئی روک ٹوک میں نے ان پر نہیں رکھی تھی۔ مجھے معلوم تھا میرے گھر کے دروازے بند رہے تو وہ میرے گھر کا پتہ بھی پوچھنا چھوڑ دیں گیں۔

ایسے ہی گزر رہے تھے سارے ماہ و سال۔ وقت کی رفتار کا پتہ بھی نہیں چل رہا تھی زندگی ایک ڈھونگی کی طرح میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔ اور میں قطعاً اس فریب سے باہر آنا نہیں چاہتی تھی جس کی بنا پر میں اس ادھ موئی زندگی سے نجات پا چکی تھی۔

لیکن کب تک، دونوں راستے چکی کے دو پاٹ تھے درمیان میں مَیں ہکا بکا۔ ایک طرف تنہائی کی جوالا مکھی دوسری طرف اس سے بہت الگ، مجھے ایک ایسے راستے پر لے جانے والی زندگی جو مجھے اس جہاز کی طرح نظر آ رہی تھی جو ڈوبنے سے بچنے کے لیے کسی اجنبی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا پڑا ہوا اور اب شوریدہ موجیں اس کی حالت کو اور تباہی کی طرف لے جا رہی ہوں۔ جو عرصہ دراز سے آبی پرندوں کی چہلیں کرتی آوازیں سن رہا ہو۔ لیکن خود گم سم ہو۔

(۱۰)

کئی ماہ سال یوں ہی گزر گئے۔ میرا دماغ بھیگی ہوئی روئی کے نمدے کی طرح ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ سب روزمرہ کے واقعات سے مل جل کر مجھے سست رفتار بادل کی طرح بنا رہا تھا جو بنا پانی برسائے گزر جاتا ہو اور کوئی اس کو دیکھنے کی مہلت نہیں رکھتا ہو۔ روزمرہ جو مجھے فرار کے راستوں کی طرف لے جاتے جو مجھے میری بیتی ہوئی زندگی سے

آنکھ مچولی بھی نہیں کھیلنے دیتے۔ لیکن جو میرے اعصاب میں اب مبہم تناؤ پیدا کر رہے تھے۔

آہستہ آہستہ میں اس جال کو بھی توڑ رہی تھی۔ جو شور اور سفر نے میرے اردگرد پھیلا دیا تھا۔ رسمی رفاقتیں، علیک سلیک کرنے والے لوگ میرے بہی خواہ، میری دلداری میں کوئی کسر نہ چھوڑنے والا، رغبت سے لبریز ماحول جو مجھے اس بات کا یقین دلا رہے تھے کہ میں اب تک خسارے میں تھی۔ لیکن ان کے بیچ کبھی کبھی ایک بھولی بھٹکی سسکی میرے سینے میں جنگل میں گرنے والی بجلی کی طرح جو کہیں جنگل کا کچھ حصہ جلا دیتی ہے۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

لیکن کب تک؟ میں اب اوب رہی تھی، اس رسمی زندگی کے آداب و اطوار سے اب مجھے اکتاہٹ اور بے زاری ہو چلی تھی۔

کبھی کبھی اب مجھے اپنے آپ سے ایک ایسے برتن کی سی بو آتی تھی جسے قلعی کرانے کی ضرورت ہو۔ ایک ایئر پورٹ سے دوسرے ایئر پورٹ تک، ایک زمین سے دوسری زمین تک، کلبوں اور ہوٹلوں میں پھرتے پھرتے، دوستی کی تہذیب نبھاتے نبھاتے مجھے ایسا لگا جیسے میں اپنے ہی ہاتھوں کٹھ پتلی بنی ہوئی ہوں۔ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا ہوا وقت جو دھول بھی نہیں اڑا رہا تھا جو سب کچھ دھند میں بدل دیتا اور مجھے آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ جس آسودگی کے لیے میں نے یہ راستہ چنا تھا۔ وہ آسیب کی شکل اختیار کر رہی تھی جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ مجھے اپنے اجنبی ہونے کا احساس بڑھ رہا تھا۔

اب ایک ایک پل مجھے ایک نئی تنہائی کی طرف بڑھا رہا تھا۔ ایسے موقعے پر جب سڑکیں لبالب بھری ہوتیں، بھیڑ کندھوں کو چھیل رہی ہوتی اور قہقہے جسموں میں ارتعاش پیدا کر رہے ہوتے عین اس وقت میرا دل رائی کے دانے کی طرح اس گہما گہمی کے قدموں تلے کچلا جا رہا ہوتا۔ اگرچہ کہ اس میں میرا قہقہہ سب سے بلند ہوتا اور میرا جسم اور

جسموں سے زیادہ مرتعش۔ بعض دفعہ تو میں خود اپنے دل کی طرف سے آنکھیں موند لیتی۔ اور اس کا یہ حشر دیکھ کر میں بہت خاموشی سے کڑھتی۔ وہ مجھے ایک ایسی مسمار عمارت کی طرح نظر آتا جس کے اندھیرے خوف پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔

میں اس عرصے میں یہی سمجھتی رہی کہ میں نے اب خود کو برباد ہونے سے بچا لیا ہے۔ اور وقت کی تانوں میں اب میرا جسم کسی یاد کے ہاتھوں ملیا میٹ نہیں ہوگا۔ سب کی طرح میں بھی جیوں گی۔ ایک ایسی زندگی جو سب کو نظر آتی ہے۔

خود فراموشی کی، جس میں خود سے کسی رابطے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ بس دکھاوا ہی دکھاوا۔ اور دکھاوے کا گھمنڈ۔

لیکن مجھے ایسا بھی لگتا جیسے میں ایک ایسے خواب میں چل رہی ہوں جو آنکھ کھلتے ہی مجھے میری دنیا میں لے جائے گا، وہ دنیا جو میں بھلا بیٹھی ہوں، ایک ایسا خواب جو زبردستی مجھے اس دنیا میں گھسیٹ لایا ہے۔

ایک ایسی دنیا میں جو میری نہیں ہے۔ لیکن میں اس میں جی رہی ہوں، اس وقت تک جب تک میری آنکھ نہیں کھلتی۔

ان رابطوں کے بیچ جو میری ناہموار زندگی کو بہلاوا دے رہے تھے میں چل رہی تھی ایسے جیسے کوئی بھوکے پیٹ چلتا ہو، یوں کہ یہ ہوک کہیں جا کر ختم ہو جائے گی۔

میرے ساتھ زندگی مسلسل مذاق کر رہی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے نبٹنے کا موقع بھی نہیں دے رہی تھی۔ یہ ایک ایسی آنکھ مچولی تھی جس میں، میں ہی خود کو ڈھونڈھ رہی تھی اور پکڑ رہی تھی۔

تمام دن تو ایسے گزرتا جیسے وہ میرا ہے، اور رات وہ اپنی تمام تر تباہ کاریوں کے ساتھ میرے بستر میں در آتی۔ جہاں نہ نیند ہوتی اور نہ خواب، میرے تمام دن کی محنت جو میں دل بہلانے میں لگاتی تھی مٹی میں مل جاتی۔ میرے کام کی نوعیت بھی ایسی تھی کہ دن زنانے سے گزرتا ہوا لگتا اسی دوران گاہے بگاہے وہ مصروفیت جو وقت گزارنے کے لیے

ایک مجبوری تھی۔ زمانہ جو ماہ و سال کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا اور وقتاً فوقتاً میری بے بسی کا مذاق اڑاتا رہتا تھا۔ اور رات اپنی بے ہنگم شکل میں ہمیشہ موجود ہوتی۔ جو بستر میں تنہائی کی شکل میں ہوتی۔ وہ جو ہیولہ بن کر کسی نقطے میں تبدیل ہو جاتی اور سیاہی کی ایک ایسی صورت اختیار کرتی جو پھیل کر میرے پورے جسم کو ڈھانپ لیتی، اور میں ایک اسے اندھیرے میں جا پڑتی جس میں کچھ بھائی نہ دینے والی حالت میں، میں اکثر، تمام رات گزار دیتی۔ جہاں نہ وہ گہما گہمی ہوتی نہ قہقہے اور نہ ستائش سے لبریز آوازیں جو دن میں میری دلجوئی کا باعث بنتی رہتیں۔ آہستہ آہستہ یہ سب بھی بے رنگ ہوتا جا رہا تھا۔ بس دھیمے سروں میں ایک ایسی آواز میرے کانوں کو اب اکثر سنائی دیتی تھی، جو کسی دوپہر میں دھول کے بگولوں کے اڑنے جیسی ہو۔ جو بھولے ہوئے دنوں کو اور بھلا دے یا ان میں جھلسا دینے والی تپش کا اضافہ کر دے۔

وقت اب اسی طرح چل رہا تھا اس کی تکمیل اگرچہ کے میرے ہاتھ میں نہیں تھی لیکن کچھ ایسا ضرور تھا کہ جیسے کوئی ڈوبتا ہوا کبھی پانی کے اوپر سر نکال کر یہ سمجھتا ہو کہ اب بچ گیا ہو اور کبھی پانی کے نیچے زندہ رہنے کی آس ختم ہوتے دیکھ کر ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ کبھی مجھے ایسا لگتا جیسے میں کسی صحرا میں کھڑی ہوں اور خود کو ہی پکار لگا رہی ہوں۔ اور میری آواز ہوا اپنے ساتھ سمیٹ کر لے جائے مجھے سنائے بغیر۔

تمام تر آسائشوں کے باوجود نا آسودگی کے پہرے میرے دل و دماغ پر براجمان تھے۔

(۱۱)

یہ میری ملازمت کے سلسلے کا ایک سفر تھا۔ جہاز ایک نئی زمین پر لینڈ کر رہا تھا۔ ملازمت کے ساتھ میری مصروفیات بھی تھیں جو زندگی گزارنے کے لیے اور اپنے چاروں طرف ایک جال بچھانے کے لیے میں نے شروع کر دیں تھیں ایک ایسا جال جو مجھے میرے کسی بھی خیال کو وہاں نہ جانے دے جہاں سے میں بھاگ آئی ہوں۔

میں نے کاؤنٹر سے اپنا سامان اٹھایا اور ایئر پورٹ سے باہر آنے لگی۔ مجھے لگا کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میں تیز چل رہی تھی باہر گاڑی میرے انتظار میں کھڑی تھی ایئر پورٹ کے قریب ہی ایک ہوٹل میں میرے قیام کا بندوبست تھا۔ میری رفتار کے ساتھ وہ قدم بھی تیز ہوتے۔ وہ جو بھی تھا اب میرے ساتھ قدم ملا کر چل رہا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ میرے لیے نا آشنا تھا یا نہیں۔

شام کے جھٹپٹے اور روشنیوں کے سامنے میرے ہی سائے نے اس کا چہرہ چھپا دیا تھا۔ اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''رک جاؤ، مجھے پہچانو۔''

''کون ہو تم؟'' میں نے اس زاویے سے آنکھیں میچ کر اس کو دیکھا جو چاروں طرف کی روشنیوں کو مدھم کر کے صرف اس کے ہیولے کو واضح کر رہی تھیں۔ میرے قدم آہستہ ہوئے۔ وہ اب میرے سامنے کھڑا ہو گیا تھا میرا راستہ روک کر۔

''میں تم کو پہچان گیا ہوں۔''

''کیسے؟'' میں بھی رک گئی۔ شاید وہ میرے لباس اور وضع قطع سے میرے ملک کا اندازہ لگا چکا تھا۔

''میں تم کو جہاز میں دیکھ رہا تھا جب تم داخل ہوئی تھیں۔ تم کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری ایک عمر گزر گئی۔''

''کون ہو تم؟'' میں نے اب تیز آواز میں اس سے پوچھا۔ میرا سایہ اب اس کے چہرے سے ہٹ چکا تھا۔ اور اب وہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے مجھے آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔ میں دائیں بائیں ہو رہی تھی۔ اور وہ نہایت چابک دستی سے مجھے نکلنے کا راستہ نہیں دے رہا تھا۔

''تم پہلے پہچانو۔ میں اپنا تمام قیمتی وقت تم کو ڈھونڈنے میں گزار آیا ہوں۔''

اب میں آنکھیں پھاڑے اس کو پہچاننے میں بھی لگی تھی، جہاں میں اس کی پہنچ

سے باہر آنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کا کوئی نقش، مجھے کچھ بھی یاد نہیں دلا رہا تھا۔ اب میں جھنجھلا رہی تھی۔ کون ہے یہ؟

اور اتنی ڈھٹائی سے میرا راستہ روک رہا ہے اور خود کو مجھے پہچنوانے میں لگا ہوا ہے۔ اس دوران بہت آہستہ سے کسی ایک لمحے میں، جیسے ایک بادل سے ہٹا ہو۔ میرے اندر ایک خوشگوار سی لہر دوڑ گئی۔ یہ خوب ہے بھولے بھٹکے ہوؤں کو پہچانتو اور اتنی زبردستی سے۔ میرے چہرے پر بھی یہ خوش گوار تاثر ابھرا ہوگا۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ ''تو پہچانا؟''

''کون ہو تم؟''

''یہی تو میں پوچھ رہا ہوں تم سے۔''

''مجھے کچھ یاد نہیں۔''

''تو یاد کرو۔'' اب وہ میرے بازو پکڑ چکا تھا۔ ایک اور لہر ابھری۔

''یہ زیادتی ہے، میں چیخ سکتی ہوں۔ میرے بازو چھوڑو۔''

''تم لاکھ شور مچاؤ، میں تم سے پوچھ کر رہوں گا کہ تم نے مجھے پہچانا۔''

''تم پاگل ہو۔''

''چلو، میرے کیبن میں چلو'' وہ مجھے اب مضبوطی سے پکڑ چکا تھا اور گھسیٹنے کے انداز میں، میں بھی لڑکھڑاتی ہوئی چل جا رہی تھی۔ ہمارے قریب سے گزرنے والے ایک ادائے بے نیازی سے ہمیں دیکھتے ہوئے ایسے جا رہے تھے گویا ہماری یہ کھینچا تانی ان کی آنکھوں کو اچھی لگ رہی ہو۔ ''میں تم کو سب کچھ بتا دوں گا۔''

''لیکن تم یہ کیوں نہیں پوچھ رہے ہو کہ مجھے کہاں جانا ہے۔''

''پوچھوں گا۔ لیکن ابھی نہیں۔ جب تک تم مجھے نہیں پہچان جاتیں۔''

اس کی یہ ڈھٹائی اب میرے ارادوں کو کمزور کر رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ کیوں جاؤں؟ کون ہے یہ؟ یہ سوچتے ہوئے بھی میرے قدم اس جانب ہی بڑھ رہے تھے جدھر اس کے قدم لے جانا چاہتے تھے۔

"تم بھول گئیں سب کچھ؟ وہ باتیں جو ہم بچپن میں کیا کرتے تھے۔ یاد کرو۔ یاد آیا۔" وہ اصرار کر رہا تھا اور میں اس کی شکل میں اور اس کی آواز کی ضد میں کچھ ڈھونڈنے نکل گئی تھی جیسے کوئی پرانی رنگ برنگ کی دھجیوں میں اپنی من پسند رنگ کی دھجی تلاش کر رہا ہو۔ کون ہو سکتا ہے یہ؟ میں اپنے دل سے پوچھ رہی تھی۔

اب ہمارے راستے میں ایک ٹکڑا اندھیرے کا آ گیا تھا۔

"وہ ایک ساتھ کھیلنا، دھول اڑانا۔ ایک دوسرے کو ڈھونڈنا، بولو، بولو۔"

وہ اس طرح کہہ رہا تھا جیسے مجھ سے کسی جرم کا اقرار کروانا چاہتا ہو۔ میں ہکا بکا اندھیرے کے آر پار کچھ پھر تلاش کر رہی تھی۔ اب اس کی بانہیں میرے جسم کو دبوچے ہوئے تھیں۔ اور اس کے ہونٹ اور اس کی آنکھیں والہانہ انداز میں اصرار کر رہی تھیں کہ میں اس کو پہچانوں۔ اندھیرے کا چھوٹا ٹکڑا ختم ہو گیا تھا اب ہم روشنی میں تھے۔ لیکن ہمارے سائے ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ میں نے چاہا کہ اس کی گرفت سے آزاد ہو جاؤں اور اس طرف نکل جاؤں جہاں میری گاڑی میرے انتظار میں تھی۔ لیکن میرے اعصاب اب اس طلسم کی زد میں آ چکے تھے۔ میں اس کے ساتھ کم و بیش گھسٹتی ہوئی سی چل رہی تھی۔

ساتھ ہی ساتھ اس کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے ساتھ آؤ، میں تم کو بتاؤں گا ہم کہاں ملے تھے۔

اور میں ایک بار پھر بھولے بھٹکے ہوئے کی طرح خود کو سنبھال رہی تھی اور یادداشت کے ان سروں کو پکڑ رہی تھی جن سے میں نے اپنے تئیں پیچھا چھڑا لیا تھا۔

"تم مجھے کیسے جانتے ہو۔ ہم کہاں ملے تھے؟ کون ہو تم؟"

میں آہستہ آہستہ یادوں کے مرغولوں میں اتر رہی تھی اور ایک ایسے راستے کی طرف مڑ چلی تھی جس کو میں پلٹ کر دیکھنے کی بھی خواہش دل سے مٹا بیٹھی تھی۔ اب میں بے سدھ ماضی کے جھنپٹوں میں اترنے لگی تھی۔ میں اس کی گرفت سے باہر ہونا

چاہتے ہوئے بھی ایسا نہ کرسکی اس کی بے قراری اور بے چینی مجھے دبوچے ہوئے تھی۔
اس کھینچا تانی کے دوران وہ مجھے اپنے کیبن تک لے جا چکا تھا۔ وہ مجھے اس طرح گھسیٹ رہا تھا جیسے کوئی بچہ اپنا کھلونا چھین رہا ہو۔
اب میں چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس کے چہرے پر نظر رکھے تھی اور بہت دور مٹے ہوئے نقوش کھوج رہی تھی۔
ننھی ننھی مچھلیوں سے بھرے تالاب سے ملا ہوا اس کا کیبن اب اندھیرے میں ڈوب رہا تھا۔ میں سوائے اس کے کہ اس کے چہرے پر بھولا ہوا کوئی عکس دیکھ لوں، کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی، کیا زندگی مجھ پر مہربان ہے؟ کیا میں پھر اس زمانے میں ہوں، جو کھو یا گیا تھا، اور جس کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر میں لہولہان تھی۔ مجھے اچانک کوئی آسیب اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ تو تم کون ہو؟ میں اب ہذیانی انداز میں اس سے مخاطب تھی۔ تم، کہتے ہی میں ماضی کے اس حصے میں تھی جہاں میں اور موسیٰ مضبوطی سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دوڑ رہے ہیں اور گول دائروں میں گھوم رہے ہیں سارا میدان ہمارے قدموں کی دھول سے اٹا ہوا تھا۔
''کیا تم موسیٰ ہو؟'' میں نے اس کے بازوؤں سے خود کو چھڑاتے ہوئے پوچھا۔
ایک منٹ کے لیے وہ ٹھٹکا، پھر آہستہ سے اس نے مجھے اپنی گرفت سے آزاد کیا۔
''تو تم آخر مجھے مل گئے۔ اور مجھے پہچان گئے۔ میں نے تم کو کہاں کہاں نہیں ڈھونڈھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کا چہرہ ٹٹولتے ہوئے کہا۔ تمھاری آنکھیں، تم، تمھاری آواز، تم ویسے ہی ہو جیسا موسیٰ کو ہونا چاہیئے تھا۔ تم موسیٰ ہو۔ بولو تم کون ہو؟''
وہ چپ تھا۔ اور میری آواز پر کان دھرے ہوئے تھا۔ میں موسیٰ ہوں یا نہیں، لیکن تم وہی ہو جسے میں ڈھونڈھ رہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے میرے سوالوں کے جواب میں مجھے جھپٹ لیا تھا۔ اور صرف اس کی سرگوشیاں میرے کانوں میں ساحل پر غراتی ہوئی سمندری لہروں کی سی آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ کیبن کے سناٹے میں میری آواز بھی

بھنور سے لپٹی ہوا جیسی ہو چلی تھی۔ تم موسیٰ ہو، تم موسیٰ ہو۔ کبھی یہ آواز، سوال کی شکل میں میرے حلق سے نکلتی اور کبھی ایسی غیر یقینی خوشی کے بوجھ سے لبریز جو میرے لیے بھی نا آشنا تھی۔

کیبن میں اتنا سکوت تھا کہ میری آواز اور اس کی سرگوشیوں نے مل کر ایک ایسا مدھم آوازوں کا کہرام سا مچا دیا تھا۔ جو ساری فضا کو ایک طلسم میں بدل رہا تھا۔ جو بہت اجنبی غنودگی میں ڈوبا ہوا مجھے ایک ایسی خود فراموشی کی طرف لے جا رہا تھا جہاں سمندر کی نچلی سطح پر پڑے ہوئے کسی آبی پودے کی شاخوں کی طرح، میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

اندھیرے نے بھی اب کیبن کو مزید گھیر لیا تھا۔ اب اسے کھوجنا میرے لیے اور مشکل ہو رہا تھا۔ میں موسیٰ کی پکار کی تان میں ہی اس یقین میں داخل ہو رہی تھی کہ وہ موسیٰ ہے۔ اندیشوں کی گھمبیر سفاکی کے باوجود میں اس یقین کو خود پر مسلط کرتی رہی اور ایک ایسی بیہوشی میں جا پڑی جہاں سے نکلنا میرے بس میں نہیں تھا۔

شاید دن کی چڑھتی دھوپ نے مجھے جگایا تھا۔ میں نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا کیبن میں رات جیسا ہی سناٹا تھا۔ لیکن وہاں میں اکیلی تھی۔

(۱۲)

موسیٰ کا لباس میرے پاؤں پر پڑا تھا۔ موسیٰ، موسیٰ میری آواز اس تعلق سے لبریز تھی، جس نے مجھے آج تک شرابور کیا ہوا تھا۔ خالی کیبن میں صرف میری آواز گونج رہی تھی۔ میں نے کروٹ بدل کر دیکھا۔ موسیٰ کہاں ہے۔ کمرے میں اجنبیت اور بے سروسامانی تھی۔ شناسائی کا کوئی بھی احساس نہیں تھا۔ سوائے کمرے کی دیواریں ،جو میری زدہ حالت پر مجھ پر ترس کھا رہی تھیں۔ میری آنکھوں میں آنسو بھی نہیں تھے۔ رات کا طلسم ابھی باقی تھا۔ اور وہ احساس کہ موسیٰ میرے پاس تھا۔

میں نے ایک بار پھر موسیٰ کو پکارا۔ میری آواز دیواروں سے ٹکرا کر کھلکھلاتی ہوئی

میرے پاس پلٹ آئی۔ محبت کے اس ناٹک نے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا۔ میں اس وقت خود پر ترس کھانا بھی نہیں چاہتی تھی سوائے اس کے کہ جو کچھ تھا وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اور یہ کہ میں اپنے کسی خواب کا سرا پکڑ بیٹھی تھی۔

میں نے کپڑے اپنے جسم پر ڈالے اور باہر نکل آئی۔ باہر تالاب کی رنگ برنگی مچھلیاں تالاب پر پڑنے والی تازہ دھوپ میں اپنے ہی رنگوں سے جشن مناتی نظر آرہی تھیں۔ فضا میں کسلمندی کے ساتھ ساتھ ایک نئی اور سب بدل دینے والی نمی موجود تھی۔ اور میرا دل اگلے پچھلے تمام زمانوں کے ساتھ بہت دور نہ سمجھ میں آنے والی تانوں کے ساتھ بہا جارہا رہا تھا۔

میں نے تالاب کے پانی میں اپنا عکس دیکھا، میرے جسم پر میرا چہرہ نہیں تھا، وہاں موسیٰ کا چہرہ مچھلیوں کے ساتھ ساتھ گول گول دائرے بناتا اپنی اداس آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ موسیٰ کا وہ چہرہ جو میں، اپنے پرانے گھر کے آئینے میں چھوڑ آئی تھی۔

موسیٰ نے ایک بار پھر مجھے مات دی تھی۔ ایک بار پھر موسیٰ مجھے زندگی کے اس میدان میں دھول اڑانے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ میرے سارے سفر جو میں نے اس کو ڈھونڈنے اور بھلانے کے لیے کیے تھے سب ہوا میں تحلیل ہو گئے تھا۔ موسیٰ کے ہاتھوں یہ شکست میری برداشت سے باہر تھی۔ کیا وہ موسیٰ نہیں تھا۔ اگر وہ موسیٰ نہیں تھا تو میں کون تھی۔

میں گم سم تھی۔ اور زندگی کے اس وار پر ششدر۔

میں نے اپنے تھکے ہوئے جسم کو سمیٹا اور واپس اپنے شہر آ گئی۔ اماں ابا کا گھر پرانے کھنڈر کی طرح میرے سامنے کھڑا تھا۔ زنگ آلود تالا کھول کر میں اندر داخل ہوئی۔ برآمدے میں اماں کے لگائے ہوئے بیلے اور موتیا کے پودے بھربھری مٹی کے ساتھ مل چکے تھے۔ سارا صحن ایک ایسے جنگل کا ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا جہاں انسانی قدم کبھی نہ گزرے

ہوں۔ سوائے سائیں سائیں کرتی نا آسودہ ہوائیں۔

میں نے سارے گھر میں ایسے چکر لگایا جیسے کوئی پرندہ دن بھر کی اڑان کے بعد واپس آ کر اپنے ٹھکانے کو پہچانے۔ سب سے پہلے میں نے اماں ابا کا کمرہ کھولا جس میں اماں ابا کے بستر غمناکی سے پڑے ہوئے تھے۔ سب کچھ ویسے ہی تھا بس دیر تک ہاتھ نہ لگائی ہوئی چیزیں ایک اداسی سے جا ملی تھیں۔

پھر اس کمرے کی طرف بڑھی جس کو میں اس طرح بند کر کے گئی تھی کہ اب نہیں کھولوں گی۔ دروازہ کھولتے ہی ایک بھبھکا گیلی مٹی جیسا میری ناک میں گھسا۔ میرے کمرے میں ایک سہمی ہوئی افسردگی پھیلی ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یوں بھی جیسے اسے یقین تھا کہ اسے میرے ہاتھ ایک دن ضرور کھولیں گے۔ میں اپنے بستر پر بیٹھ کر دیر تک اس کی شکنیں دور کرتی رہی، اگرچہ کہ اس پر پڑی ہوئی دھول نے میرے ہاتھوں کو سان دیا تھا۔ لیکن ملائم دھول پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے اماں کی باتیں تسلسل میں یاد آتی چلی گئیں۔ دل میں ایک کہرام مچ رہا تھا۔ کمرے کی دیواریں مجھے اپنی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئیں جیسے مجھے اب یہاں سے کبھی نہ جانے کے لیے دبوچ لیں گی۔

میں نے اس آئینے کی طرف دیکھا جو میرے ہجر میں میرا شریک رہا تھا۔ وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ رہا تھا اور اپنی چمک کھو چکا تھا۔ میں نے اپنا عکس آئینے کے حوالے کیا۔ میرا چہرا مجھے یکسر بدلا ہوا ملا۔ مجھے اپنا جسم ایک خواب اور دھند میں لپٹا ہوا ملا۔ میں تنہا کھڑی تھی۔ یہ آئینہ کہہ رہا تھا۔

وہاں کوئی اور نہیں تھا، کوئی نہیں۔

میں دیر تک آئینے میں خود کو دیکھتی رہی شاید کوئی عکس ابھر کر آئے، شاید۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تنہائی اور اس کے بگولے اندھیرے کے ساتھ مل کر میرے دل میں جنگل میں سرسراتی ہواؤں کی طرح ایک خوف پیدا کر رہے تھے۔ جو مجھ سے سہا نہیں جا رہا تھا۔ میں

سمٹ کر اپنے دھول سے اٹے بستر پر لیٹ گئی اور دیر تک سوتی رہی۔

میرے ہاتھ گھر کی دھول صاف کرنے میں کئی دن تک لگے رہے۔ شاید یہ میری آخری قیام گاہ تھی۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سوائے اس کے کہ سناٹا اب اپنی اتنی پہچان رکھتا تھا کہ میرے قدموں کی چاپ بھی مجھے سنائی نہیں دیتی تھی۔

(۱۴)

باہر کی دنیا سے میرا سروکار اب صرف اتنا رہ گیا تھا کہ میں اپنا رزق کھوجنے کے لیے باہر قدم رکھتی، ورنہ اب رات دن میری آنکھیں میرے جسم کی تبدیلی کو دیکھتی رہتیں۔ جو روز بروز ایک حیرت کے ساتھ مل کر مجھے ایک ایسی دنیا میں لے جا رہا تھا۔ جہاں میری تنہائی جس کے بغیر اب میرا رہنا محال تھا معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ اپنے جسم کی اس تبدیلی سے آہستہ آہستہ شناسا ہو رہی تھی، ایسی شناسائی جو مجھے کبھی ہنسنے پر مجبور کرتی اور کبھی رونے پر۔ میرا دل کبھی ایسی فراغت سے نہیں ملا تھا۔ کبھی کبھی وہ ایسی پینگوں میں جھلانے لگتا جو مجھے آسمان تک لے جاتیں۔ تازہ اور ٹھنڈی ہواؤں سے ملاتیں۔ میرے سارے جسم میں کبھی کبھی ایک گدگدی سی اٹھنے لگتی جو مجھے دیر تک ہنساتی رہتی۔ اب میرے اندر ایک لہک سی رہتی، اب اماں کی کیاریاں نئے سرے سے لہلہانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ موتیا اور بیلے کے پھول اب پھر اپنی خوشبو سارے صحن میں بکھیرنے لگے تھے۔ میرا تمام وقت ایک عجیب آسرے میں گزر رہا تھا۔ ایک نا معلوم انتظار، ایک مبہم آس۔ اور ایک ایسا خواب جس کو دیکھنے کے لیے میں ایک نیند کا سہارا لینا چاہتی تھی۔ لیکن میری آنکھیں اس ڈر سے بھی کھلی رہتی تھیں کہ کہیں وہ جاگتے کا نہ ہو۔

جو کچھ میرے جسم کے ساتھ ہو رہا تھا سب کچھ نیا اور حیرت انگیز تھا۔ کبھی کبھی میں ایک غنودگی میں چلی جاتی جہاں ایک میدان ہوتا۔ ایک گول گول گھومتی ہوا ہوتی جو مجھے ایسا اڑاتی کہ میں بادلوں کو چھونے لگتی، ان کی ٹھنڈک میرے سارے جسم کو بھگو دیتی۔ میں

کھلکھلاتی اور ایک ایسے بچے کی طرح ان میں قلابازیاں کھاتی جو ابھی گھٹنیوں چلنا سیکھ رہا ہو۔

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا، میں رات گئے اس کونے کی طرف بھی ہو لیتی جہاں ایک مبہم سا گڑھا کبھی اندھیری راتوں میں کبھی چاند کی روشنی میں، جو کسی بے یارو مددگار شخص کی طرح پڑا کسی کا انتظار کر رہا ہو۔

اس تمام بدلتی ہوئی حالت کے دوران جو میرا بدن مجھ سے کہہ رہا تھا میں کسی کو اپنا شریک نہ بنا سکی کوئی نہیں تھا میرے آس پاس جسے بتاتی کہ کیا ہو رہا ہے سوائے اس آئینے کے، جواب بھی میرے ساتھ ایک گمان کی طرح ہوتا۔

(۱۴)

وہ عجیب کہر زدہ سی رات تھی۔ میری آنکھیں اس درد سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ وہ درد جو میرے بدن کو چیر رہا تھا۔ میں بے یارو مددگار اس درد کے دکھ کو اپنے سارے جسم میں رینگتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ جیسے کہیں آتش فشاں پھٹنے جا رہا ہو۔ درد کا یہ لاوا، رات کی تنہائی سے مل کر میرے خلاف آگ اگل رہا تھا۔

میں نے خود کو ہسپتال کے دروازے پر لا کھڑا کیا۔ اس درد نے مجھے بے ہوشی سے جا ملایا تھا۔ اس دوران مجھ پر کیا گزری، مجھے کب ہوش آیا، یہ بتانے والا کوئی نہیں تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو ایک نرس بہت مستعدی سے میرے چاروں طرف منڈلا رہی تھی۔ میں نے نیم غنودگی کے عالم میں اس سے پوچھا، ''میں کہاں ہوں؟''

وہ مسکرائی، ''تم ہسپتال میں ہو''

''وارڈ نمبر،'' وہ منھ ہی منھ میں بڑبڑائی۔

میں اس کی آواز صاف نہیں سن سکی۔ ''تمھارے ساتھ کوئی نہیں ہے؟ تم یہاں اکیلی آئی ہو۔'' وہ میرے قریب ہو کر بولی۔ اس کے سوال میں حیرت بھی تھی۔

میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میری آنکھیں ادھ کھلی کھڑکی سے نظر آنے والے آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ وقت کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ ابھی رات باقی ہے یا صبح ہوا چاہتی ہے۔ کمرہ بھی دھندلی روشنی میں دھندلایا ہوا تھا۔ نرس تھوڑی دیر تک میری شکل دیکھتی رہی، پھر کوئی جواب نہ پا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ نرس کے جانے کے بعد میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ میں شاید لیبر روم میں تھی ایک مخصوص بو میری سانس کے ساتھ میرے پیٹ میں داخل ہو رہی تھی اور متلی کی فضا بنا رہی تھی۔ میں نے متلی کے لیے سر اٹھایا بہت سارا پانی غلاظت کی صورت میں میرے پیٹ سے باہر آ کر گرا۔ اسی دوران میں نے دیکھا، خون کے ننھے ننھے لوتھڑے میری پائنتی کے حصے میں زمین پر گرے ہوئے تھے۔ میرے بدن میں ایک جھرجھری سی اٹھی۔ میں اپنے حواس سمیٹنے لگی۔ نہ جسم کا وہ تناؤ باقی تھا نہ درد کی وہ شدت۔ جیسے سمندر کی طغیانی کے بعد اس کی سطح اس کے کناروں پر اپنے ہموار ہونے کا پتہ دیتی ہے۔

میں نے اب آنکھیں موند لیں تھیں اور آنے والے دنوں کو بس دور سے نظر آنے والے چراغوں کی ٹمٹماتی ہوئی لو کی طرح دیکھ رہی تھی جہاں نہ اندھیرا تھا نہ روشنی۔

نرس کے قدموں کی آواز نے خیالوں کے تسلسل کو روک دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ اور قلم تھا۔ ''بچے کا نام لکھواؤ۔'' وہ میرے سرہانے آ کر رسانیت سے بولی۔

نام؟...... میں نے اپنی آنکھوں میں تیز روشنی اترتی ہوئی محسوس کی۔

''ہاں نام؛ کیا رکھا ہے تم نے اپنے بچے کا نام؟''

میں دھند میں داخل ہونے لگی چکر کھاتی ہوئی۔ ایک بار پھر میرا جسم درد کی ٹیسوں میں اتر گیا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ نرس مجھے تسلی دے رہی تھی۔ ''تمہیں خوش ہونا چاہیے تم اب بالکل خیریت سے ہو۔ سب بھول جاؤ۔ مجھے تمہارے بچے کا نام لکھنا ہے۔ بولو......'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں خواب اور دھند سے باہر نہ نکل سکی، ایک بارگی بہت پیچھے کہیں دور اس میدان میں جا کھڑی ہوئی جہاں موسیٰ اپنی چھوٹی انگلی سے زمین

کھود رہا تھا۔ اور میں اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر اس کو پکار رہی تھی۔ موسیٰ ،موسیٰ۔ شاید وہ میری آواز سن نہیں رہا تھا۔ موسیٰ ،میری آواز اس بار ایک چیخ کی طرح نکلی تھی۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔'' میں نرس کو اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے، کاغذ پر مسکراتے ہوئے کچھ لکھتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ میرے گال تھپتھپاتی ہوئی بولی،'' ہاں موسیٰ ٹھیک ہے۔ اور اس کے فادر کا نام؟''

میرا دماغ اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں بلبلا اٹھی۔ ''بند کرو، یہ بکواس بند کرو۔''

میں چیخ رہی تھی۔ اب وہ خوف زدہ ہو کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ ''لیکن تم کو اس کے باپ کا نام تو لکھوانا ہوگا۔ یہ ضروری ہے۔''

شاید سب کچھ جانتے ہوئے اب اس کی آواز میں رحم کا عنصر تھا۔ میری تلملاہٹ اور بے چینی اس پر منکشف تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا:'' موسیٰ۔''

''ہاؤ اسٹرینج،از ہز فارورز نیم۔''

میں تھوڑی دیر اس کی ہکا بکا شکل دیکھتی رہی ،پھر اس کے چہرے پر پھیلی حیرت میں تاسف کو دیکھ کر میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

مجھے ایسا لگا جیسے خزانہ کھودنے کا جو کام موسیٰ میرے سپرد کر گیا تھا وہ اب ختم ہو چکا ہے۔ اگرچہ کہ میری تمام انگلیاں ضائع ہو چکی تھیں۔

اور میں گردن تک مٹی کے ڈھیر میں دھنسی ہوئی کھڑی تھی۔

عذرا عباس کا مختصر ناول ''میں اور موسیٰ'' ایک خواب اور ایک نظم کے درمیان چلتا ہے۔ شاید یہ خواب ہے اور شاید نظم بھی۔ بچپن کی حیرت کے اس پار سے ایک لڑکی دیکھتی ہے کہ غریب بستی میں رہنے والا ایک بچہ جس کے کپڑے میلے ہیں اور وہ اسکول نہیں جاتا، وہ اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں سے زمین میں ایک گڑھا کھود رہا ہے کہ یہاں سے خزانہ نکلے گا اور یہ خزانہ اس بستی کے لوگوں کی قسمت بدل دے گا۔ اپنے ماں باپ کی مخالفت کے باوجود وہ لڑکی بھی اس خواب سے بندھ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ بے نام تعلق اس کی اپنی قسمت بدل کر رکھ دیتا ہے۔

حیرت سے لے کر دیوانگی تک، یہ خواب اس لڑکی کی زندگی پر چھایا رہتا ہے۔ خواب اور نظم کے رنگوں سے عذرا عباس نے یہ کہانی لکھی ہے جہاں کہانی اپنی حقیقت خود تعمیر کرتی ہے۔

معروف شاعرہ عذرا عباس کی پہلی کتاب، طویل نظم ''نیند کی مسافتیں'' ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں سے تازہ ترین کتاب ''حیرت کے اس پار'' ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ عذرا عباس کے افسانوں کا مجموعہ ''راستے مجھے بلاتے ہیں'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ ''میں اور موسیٰ'' عذرا عباس کا پہلا ناول ہے جس پر وہ کئی برس سے کام کرتی رہی ہیں۔

عذرا عباس کا قیام لندن میں ہے۔ اُن کی زیرِ تصنیف کتابوں میں ان کی خود نوشت شامل ہے۔

Price Rs: 120/-
ISBN: 969-8636-74-9